کرشن چندر
کانچ کے ٹکڑے

کانچ کے ٹکڑے

کرشن چندر

کرشن چندر

شاداب بک سنٹر

۳۱۷- ذوالقرنین چیمبرز- گنپت روڈ- لاہور

اہتمام: فلاح الدین قریشی

ناشر:

پریس: منظور پریس لاہور

تعداد: ایک ہزار

قیمت: نو روپے (۹-۰۰)

خوش نویس: سلطان احمد، گجرات، ۹،۶ع

فہرست

۱۔ پالنا ۹
۲۔ کتا پلاننگ ۳۱
۳۔ ملکہ کی آمد ۵۲
۴۔ گندہ دان ۷۱
۵۔ پرانا قرضہ ۸۹
۶۔ پھٹا لحاف ۱۰۱
۷۔ رشتہ کی ضرورت ۱۲۷
۸۔ خالی قبر ۱۵۱
۹۔ ٹیکسی ڈرائیور ۱۶۵

"لوگ اسے عینک کہتے ہیں مگر میرے خیال میں یہ صرف کانچ کے ٹکڑے ہیں جو کمانی میں پھنسا دیے گئے ہیں......

......لیکن کانچ کے یہ ٹکڑے معمولی بھی نہیں ہیں کیونکہ جب میں انہیں اپنی آنکھوں پہ رکھتا ہوں تو وہ سب کچھ جو اس سے پہلے نظر نہیں آتا تھا، یا پھیکا، یا پھیلا پھیلا گورکھ دھندا سا جان پڑتا تھا ..... وہ سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگتا ہے۔"

کرشن چندر

کرشن چندر کے پاس ایسی آنکھیں ہیں جو واقعات اور اشیأ کے پردے کو چاک کر کے ان کی حقیقت کو دیکھ لیتی ہیں۔

کانچ کے ٹکڑے، حقیقی واقعات کو تخیل کی چاشنی دے کر کبھی افسانے تو کبھی طنز کے سانچے میں ڈھالنے کا ایک بالکل نیا اور انوکھا تجربہ ہے۔

پالنا

پالنا

میرے ہات میں ایک عینک ہے۔
لوگ اسے عینک کہتے ہیں مگر میرے خیال میں یہ صرف کانچ کے ٹکڑے ہیں جو پلاسٹک کی کمانی میں پھنسا دیے گئے ہیں۔ جس طرح سماج کی کمانی میں آدمی آدمی کی زندگی پھنسا دی جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ زندگی ٹوٹ سکتی ہے مگر اس کمانی سے باہر نہیں نکل سکتی — یہی حال کانچ کے ان دو ٹکڑوں کا ہے۔
مگر پلاسٹک کی کمانی میں پھنسے ہوئے کانچ کے یہ دو ٹکڑے معمولی بھی نہیں ہو سکتے کیونکہ جب میں انہیں اپنی آنکھوں پہ رکھتا ہوں تو تعجب ہونے لگتا ہے، یہ سب کچھ جو اس سے پہلے نظر نہیں آتا تھا یا جو پھیکا، پھیلا پھیلا گو رکھ دھندا سا لگتا تھا، یا جو اُڑے اُڑے سے دھند لکے میں لپٹا ہوا، دھول مٹی میں اٹا ہوا دکھائی دیتا تھا، وہ سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگتا ہے۔ جیسے دھند

•

چھٹ گئی ہو، غبار دُھل گیا ہو اور ہر چیز فوکس میں ہو......... میرے خیال میں کانچ کے ٹکڑوں کا اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، اتنا فائدہ تو ضرور ہے کہ یہ ٹکڑے انسان کی آنکھوں کو ٹھیک کر دیتے ہیں۔ یوں تو ہر انسان کے پاس آنکھیں ہوتی ہیں۔ آنکھوں میں نظر ہوتی ہے۔ نظر میں نگاہ ہوتی ہے۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان آنکھیں ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھتا، نظر رکھتے ہوئے بھی اندھا رہتا ہے، نگاہ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں سمجھتا اور وہ ایسا محسوس کرتا ہے جیسے اس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں ہوں اور بیچ میں اندھیرا ہو۔ مگر یہ کانچ کے ٹکڑے بڑے عجیب ہیں، یہ دیواروں کے آر پار دیکھ لیتے ہیں۔ جہاں اندھیرا ہوتا ہے وہاں روشنی لے کر پہنچ جاتے ہیں۔ یہ چاہیں تو وقت تھم جائے، آگے بہنے لگے یا پیچھے کو چلنے لگے۔ نظر جب ان ٹکڑوں پر سے گزرتی ہے تب روشنی سے زیادہ تیز رفتار ہو جاتی ہے۔ کبھی یہ نظر پوری کائنات کو گھیرے میں لے لیتی ہے اور کبھی ایک بوند پر ہی جم کر رہ جاتی ہے۔

ہر روز صبح کا اخبار میں کانچ کے انہیں ٹکڑوں کی مدد سے پڑھتا ہوں۔ مگر ان کا برتاؤ میری آنکھ کے ساتھ کچھ عجیب سا ہے۔ مثال کے طور پر آج صبح کے اخبار میں پردھان منتری کا بھاشن پڑھنا چاہتا تھا مگر یہ کانچ کے ٹکڑے شاید کچھ اور ہی پڑھنا چاہتے تھے۔ جیسے ہی میں نے پردھان منتری کی تقریر پڑھنی

شروع کی، عین اسی وقت اخبار کے حروف میری نظر کے نیچے سے پھسلنے لگے اور پگھل کر اپنی شکل کھونے لگے۔ پھر بڑے بڑے دائرے بن کر میری آنکھوں کے گرد ناچنے لگے۔ پریشان ہو کر میں نے اپنی نظر وہاں سے ہٹالی۔ سوچا، چلو پردھان منتری کا بھاشن نہ سہی۔ کوئی دوسری ہی خبر پڑھیں گے۔ ذرا معلوم تو کریں افریقہ میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ جاننے کے لیے میں نے اخبار کا پنّا پلٹا تو میری نظر پھسلتے پھسلتے افریقہ کی خبر سے بھی نیچے پھسلتی ہوئی ایک تصویر پر پہنچ کر رُک گئی۔ اور کاغذ کے ٹکڑے فوکس میں آ گئے۔

یہ افریقہ کے کسی بڑے نیتا کی تصویر نہ تھی۔ یہ دلی میں دریا گنج کے یتیم خانے کی ایک تصویر تھی۔ جس کے باہر ایک پالنا لٹکا ہوا تھا، تاکہ لوگ ناگ حرامی بچوں کو کسی گندی موری میں ڈالنے یا کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر پھینکنے کے بجائے اس پالنے میں ڈال جائیں۔ کس قدر بڑھیا، عمدہ اور نیک خیال آیا تھا کسی کو۔ جس کسی نے یہ ترکیب نکالی تھی، اس کے تیز ذہن کی داد نہ دینا بڑے ظلم کی بات ہو گی۔ میں نے پلک جھپکا کر غور سے اس پالنے کی طرف دیکھا تو۔ ۔ پلک جھپکتے ہی خود وہاں موجود تھا۔

ہلکے رنگ کی ایک عورت اس پالنے میں ایک بچّہ رکھ کر جلدی سے بھاگی جا رہی تھی۔ "ارے ارے، ٹھہرو!" میں نے چلّا کر کہا — مگر مجھے دیکھتے ہی وہ اور بھی تیزی سے بھاگ نکلی اور گلی کے نکڑ پر غائب ہو گئی —

میں نے ایک نظر سے پالنے میں پڑے بچّے کی طرف دیکھا، دوسرے ہی لمحہ میں
اس عورت کی طرف بھاگا۔ گلی کے آخری موڑ پر میں نے اسے جا پکڑا۔ وہ ہانپتی کانپتی
ایک ڈرگ سٹور کے خالی برآمدے میں بیٹھ گئی۔ مجھے اپنے پاس آتا دیکھ کر اس
کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے پاس جا کر کہا "تمہیں شرم نہیں آتی، اپنا بچہ
اس پالنے میں چھوڑ آئی ہو۔"

بالکل پاس سے اسے دیکھا تو محسوس ہوا کہ میرا اس سے یوں سوال کرنا
ٹھیک نہ تھا، کیونکہ وہ عمر کے اس حصے سے گزر چکی تھی جب عورتوں کے بچّہ
پیدا ہوتا ہے۔

اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا، کیوں کہ وہ بے حد گھبرائی
ہوئی تھی۔ اس نے میرے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور ان پر اپنا سر رکھ دیا۔

"یہ کس کا بچہ ہے؟" میں نے کڑک کر پوچھا۔

"میری لڑکی کا" اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"کہاں رہتی ہو"؟

"سری والاں کی گلی میں۔"

"بچّے کو واپس لے جاؤ۔"

"نہیں لے جا سکتی۔" بڑھیا نے روتے روتے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ "ابھی
تو میں اپنی لڑکی کو بھی محلے میں واپس نہیں لے جا سکتی، لوگ کیا کہیں گے؟ ابھی

تو میری لڑکی کنواری ہے۔ پھر یہ بچہ کہاں سے آیا؟ بچّی کے باپ کو تو اس کا کچھ پتہ نہیں ہے، اسے معلوم ہو گیا تو وہ میری بٹیا کو جان سے مار ڈالے گا۔"

"اور وہ بدمعاش کہاں ہے، جس نے ...... جس نے ؟ -- --

...... "

"اس نے اپنا تبادلہ باہر مدراس میں کرا لیا ہے۔ پہلے تو کہتا تھا میں شادی کر لوں گا۔ پھر چپکے سے تبادلہ کرا کے مدراس چلا گیا۔"

"تو مدراس میں جا کر پکڑ لو، اس پر مقدمہ چلا دو۔"

"کتنی بدنامی ہو گی بیٹا، سارے خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ ذرا سوچو تو، ابھی تو میری بٹیا کنواری ہے، ابھی تو کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے، ابھی تو کسی دوسری جگہ بھی میں اس کی شادی کر سکتی ہوں۔"

میں اس بڑھیا کے پاس بیٹھ گیا اور بڑے میٹھے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگا --- ذرا سوچو تو ماں! تم اس بچّے کی نانی ہو۔ وہ تمہارا نواسہ ہے۔ جیون بھر شاید تم نے اپنے نواسے کو گود میں کھلانے کا سپنا دیکھا ہو گا اور آج تم اسے یتیم خانے کے پالنے میں چھوڑ آئی ہو! ذرا سوچو تو ماں! تمہاری بیٹی کا پہلا بچہ کس ماحول میں پلے گا۔ میں تم سے کہتا ہوں تم اس بچّے کو واپس لے جاؤ۔ اسے ماں کا پیار دو۔ نانی کا لاڈ اور چاؤ دو۔ اسے تمہارے گھر میں جینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا تمہاری لڑکی کا۔ رہا شادی کا سوال، سو ہمارا دیش

اب اتنا پچھڑا ہُوا نہیں ہے ۔ آج تمہیں اونچے آدرش دیکھنے والے ایسے ہزاروں نوجوان مل جائیں گے جو تمہاری لڑکی کی دکھ بھری کہانی سن کر اس سے بیاہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے ۔"

بڑی اچھی تقریر تھی ، اس وقت خود اس تقریر کا مجھ پر اتنا اثر ہُوا کہ میری آنکھوں میں آشا کی کرنیں جھلکنے لگیں ۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور امید بھرے لہجے میں بولی :

"بٹیا کیا تم . . . . . تم . . . . . . میری بٹیا سے شادی کرو گے ؟"

"میں ؟" میں ایک دم گھبرا گیا ——— "میری بات اور ہے ، میرا مطلب ہے کہ . . . . . میری شادی ہو چکی ہے ۔" میں نے صاف جھوٹ بول دیا ۔

وہ بڑھیا میری طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے اپنے سامنے کسی دوسرے حرامی بچے کو دیکھ رہی ہو ۔ بہت دیر تک چپ چاپ دیکھتی رہی ۔ پھر جب میں نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں تو اس نے آہ بھر کر کہا ——— "ہے رام" ! اور اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھی اور میری طرف دیکھے بغیر وہاں سے چپ چاپ چلی گئی ۔

میں پالنے کی طرف چلا آیا اور ایک ایسی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا ۔ جہاں سے میں پالنے کو صاف دیکھ سکتا تھا لیکن کوئی دوسرا مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا ۔ مجھے اس بڑھیا کے سوال پر بڑا غصہ آیا تھا ۔ ہُنہ ۔ گناہ کوئی کرے اور سزا میں بھگتوں ؟ عیش کرے دوسرا اور قیمت چکاؤں میں ؟ ایسا احمق میں نہیں ہوں !

اور پھر بھئی یہ کہاں کی تُک ہے کہ جو کوئی اچھا مشورہ دے اسی کے گلے منڈھ دیا جائے وہ مشورہ! میرے کہنے کا مطلب تو صرف یہ تھا کہ اس دیس میں سینکڑوں ایسے اونچے آدرش والے نوجوان ہوں گے . . . . . . جو . . . . . میرا مطلب یہ نہیں کہ میں اُونچے آدرش والا نہیں ہوں . . . . . . مگر . . . . . بھئی، میں نے اپنے من میں اپنی ہونے والی بیوی کی جو تصویر بنا رکھی ہے وہ اس لڑکی سے الگ ہے اور یہ بات بھی ہے کہ ابھی میں شادی نہیں کرنا چاہتا، بھلا کوئی زبردستی ہے۔

لیکن مجھے ان عورتوں پر بڑا غصہ آ رہا تھا جو ماں بن کر اپنی ممتا بھول جاتی ہیں، جو اپنے بچے کو دغا دے جاتی ہیں اور اسے بے آسرا کر کے یتیم خانے کے پالنے میں چھوڑ جاتی ہیں۔

میں نے سوچا میں آج دن بھر اس پالنے کی چوکسی کروں گا اور اگر میں دن بھر ایک عورت کو بھی شرم دلا کر بچہ واپس لے جانے کے لیے مجبور کر سکا تو میری کاوش بے کار نہ جائے گی۔

مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد ایک نوجوان لڑکی آئی اور گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا ایک پارسل سا پالنے میں رکھ کر بھاگی۔

یکایک پارسل رونے لگا اور میں اس لڑکی کے پیچھے بھاگا۔ وہ لڑکی مجھے اپنا پیچھا کرتے دیکھ کر ایسی ہڑبڑائی کہ ایک سائیکل سوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی —

دو چار گلیوں میں گھومتی گھامتی آخر میں وہ پچھواڑے کی اس سڑک پر آئی جو دریا گنج میں شہر کی پرانی فصیل کے کنارے کنارے جاتی ہے۔

وہ بار بار مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتی جاتی اور میں اس سے چالیس پچاس فٹ کا فاصلہ رکھ کر اس طرح چل رہا تھا جیسے میں اس کا پیچھا کرنے کے لیے بلکہ چہل قدمی کے لیے اس کے پیچھے نکلا ہوں۔

دریا گنج سے باہر نکل کر وہ لڑکی فصیل کے باہر دیوار کے کنارے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے سامنے مرحوم آصف علی کا بُت تھا۔ پاس والے میدان میں گھوڑوں کی نمائش ہو رہی تھی۔

اس لڑکی کے بالکل قریب بائیں طرف ایک گہری کھائی تھی، جسے میونسپلٹی والے کھود کر بھول گئے تھے کہ کس مقصد کے لیے کھودی گئی تھی۔

داہنی طرف ایک فلم کا بہت بڑا اشتہار تھا۔

"دل اپنا اور پریت پرائی۔"

میں بڑے اطمینان سے سگریٹ جلا کر آہستہ آہستہ اس لڑکی کے قریب پہنچ گیا۔

وہ منہ پھیرے کھڑی تھی۔

"ہیلو!"

میں نے دھیرے سے پوچھا۔

"پریت پرائی کا نتیجہ کیا نکلا؟"

یکایک وہ میری طرف گھومی اور مجھے آگ برساتی ہوئی نظروں سے تاکتے ہوئے بولی:

"اگر تم نے میرا پیچھا کیا تو میں پولیس میں تمہاری رپورٹ کرا دوں گی۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو اور میری شکایت کر دو اور میں اس لڑکی کی شکایت کر دوں جو ابھی ابھی اپنا بچہ یتیم خانے کے پالنے میں رکھ کر آئی ہے۔"

"یہ سراسر جھوٹ ہے۔"

اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟"

"ثبوت تو ڈاکٹر دیں گے؟"

میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی شعلے برساتی ہوئی نظریں بجھ سی گئیں۔ جیسے بجلی کا سوئچ ایک دم آف ہو جائے۔

اس کے خوب صورت چہرے پر اندھیرا سا چھا گیا۔

اس کے نازک و پتلے ہونٹ کانپنے لگے اور اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"تم کتنا روپیہ چاہتے ہو؟"

"تم کتنا دے سکتی ہو؟" میں نے پُوچھا۔
ہمارے سامنے سے پولیس کا ایک سنتری ہمیں گھورتے ہُوئے گزر گیا۔
وہ بے حد گھبرا گئی۔
بولی۔
چلو موٹر میں چل کر بیٹھو۔
"وہاں باتیں کریں گے۔"
"تو تم موٹر میں آئی ہو۔" میں نے دل ہی دل میں کہا اور اس کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔
جب میں چھوٹے سے پارک کو جس میں مرحوم آصف علی کا بُت تھا اس کے ساتھ ساتھ پار کر رہا تھا۔
تب مجھے معلوم ہُوا کہ وہ اونچے پورے قد کی لڑکی ہے۔ جس کی کمر بڑی دل کشی سے لچکتی ہے، جس کے بالوں میں شونتی کے پھُول کی مہک آتی ہے، جس کی ساڑھی کا کپڑا بے حد مہنگا ہے، جس کی کار کا ماڈل صرف دو سال پرانا ہے۔
پارک سے گزر کر ہم سڑک کو بھی پار کر گئے اور اس کی موٹر میں گھُس کر پچھلی سیٹ پر جا بیٹھے۔

لڑکی نے بیٹھتے ہی اپنے کانوں کی بالیاں اتار دیں، پھر اس نے اپنے ہات کا جڑاؤ کنگن اتارا اور اپنا پرس کھول کر اس میں سے پانچ سو روپیہ نکالا۔ سب کچھ میرے ہات میں دے کر کہا۔

"یہ لو، سنبھالو ان کو اور میری جان بخشو!"

"یہ تو بہت کم ہیں۔" میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تو اور تم کیا لو گے؟" مغرور اور بدمزاج لڑکی نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

"میں چاہتا ہوں، تم اپنے بچّے کو واپس لے جاؤ۔"

"ناممکن ہے..... میں کنواری ہوں۔"

"کنواری تو نہیں ہو۔ یوں کہو کہ تم بیاہتا نہیں ہو۔"

"اچھا یوں ہی سہی...... پھر؟"

"پھر تم اس لڑکے سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں، جس سے تمہیں اپنا پریم ہے۔ تم خوب صورت ہی نہیں، بے حد حسین ہو۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔ کہ وہ کیوں تم سے شادی نہیں کرے گا۔"

"وہ تو شادی کرنا چاہتا ہے، مگر میں نہیں کرنا چاہتی!" وہ فیصلہ کُن لہجے میں بولی۔

"شاید اس واقعہ کے بعد تمہیں اس سے نفرت ہو گئی ہے؟" میں

نے پوچھا۔

"نہیں مجھے تو اس سے گہری محبت ہے۔" وہ بولی۔

"تمہیں اس سے محبت ہے؟"

میں حیران ہو کر چلّایا۔

"وہ تم سے شادی بھی کرنا چاہتا ہے، پھر تم کیوں نہیں کرتیں؟"

"کیونکہ وہ غریب ہے۔ میرا خرچ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تو تم اپنا خرچ کم کر دو۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

وہ لڑکی پھر دوٹوک لہجے میں بولی۔

"میری سب سہیلیوں نے بڑے بڑے لوگوں سے شادیاں کی ہیں، میں بھی ویسا ہی کروں گی۔"

"آخر میں نئی دلی میں ایک بہت بڑی نوکری کرتی ہوں۔ میں ایک غریب آدمی سے شادی کیسے کر سکتی ہوں۔"

"آئی سی!" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو تم ایسا کرو کہ یہ بچہ جو تم دونوں کی محبت کا پھل ہے، اس کے باپ کو دے دو۔ میرا یقین ہے کہ وہ اسے تمہارے پیار کی آخری نشانی سمجھ کر نہیں لوٹائے گا۔"

"میں اسے یہ بچّہ نہیں دے سکتی۔"

"کیوں کہ یہ اس کا بچّہ نہیں ہے۔ جس سے مجھے محبت ہے۔"

"جس سے تمہیں محبت ہے، یہ اس کا بچّہ نہیں ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"تو پھر یہ کس کا بچّہ ہے؟"

"یہ میرے ایک دوست کا بچّہ ہے۔"

"تو یہ بچّہ تمہارا نہیں ہے؟"

"بچّہ تو میرا ہے، لیکن اس سے نہیں ہے جس سے مجھے پریم ہے۔" اس بچّہ کا باپ دراصل ایک بزنس مین ہے جو میرا دوست ہے۔

"تو تم اس بزنس مین سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ وہ تمہارا خرچ یقیناً برداشت کر لے گا اور اس غریب بچے کو اس کا باپ بھی مل جائیگا۔"

"نہیں میں اس بزنس مین سے شادی نہیں کر سکتی۔" وہ بڑے دھیرج اور شانتی سے بولی۔

"وہ مجھے پسند نہیں ہے۔"

"سو تمہیں پسند ہے، اس کا یہ بچہ نہیں ہے اور جس کا یہ بچّہ ہے وہ تمہیں پسند نہیں ہے۔ تو پھر تم شادی کرو گی تو کس سے کرو گی؟"

"تمہارا پروبلم تو بہت کٹھن ہوتا جا رہا ہے!"

"خوب صورت لڑکیوں کا پروبلم بہت جلد حل ہو جاتا ہے مسٹر!"
وہ ہنسنے لگی اور اس کے خوشنما دانت کچھ لمحہ تک اس کے گلاب کی نازک پنکھڑیوں جیسے لبوں میں چمک گئے۔
وہ خوب صورت تو ضرور تھی مگر اس کی خوب صورتی کو دیکھ کر سخت اور چمکیلی چیزوں کا خیال آتا تھا جیسے بلور، سونا، موتی، ہیرا، خوب صورت لیکن سخت!
اس نے میرا بازو تھپک کر کہا۔
"گھبراؤ نہیں مسٹر! میری چنتا نہ کرو، مجھے ضرور میرے مطلب کا شوہر مل جائے گا۔ ایسا جو میرے غریب عاشق کی طرح خوبصورت اور میرے دوست بزنس مین کی طرح مالدار ہوگا اور میری پسند کا ہوگا۔"
اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔
"اب تم اپنا مال اٹھاؤ اور گاڑی سے نیچے اتر جاؤ۔ جلدی کرو۔"
میں جم کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔
"اچھا یہ بات ہے تو تم اس گاڑی سے نیچے اتر جاؤ۔"
"میں کیوں اتروں۔" وہ حیران ہو کر بولی۔
"اس لیے کہ اگر تم اپنی پسند کی خاطر اپنے بچے کو قربان کر سکتی ہو تو اسی پسند کے لیے تمہیں اس گاڑی سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔"

کیوں کہ یہ گاڑی مجھے پسند ہے۔ یہ گاڑی میرے نام لکھ دو۔

"ورنہ چلو بھاگو"

"اے مسٹر!" وہ لڑکی ایک دم چیخ کر بولی۔

اس نے زور سے میری کلائی پکڑ لی اور اپنے لمبے لمبے ناخن اس میں گاڑ دیئے۔

"مسٹر میں تمہیں سب کچھ دے سکتی ہوں مگر یہ گاڑی نہیں دے سکتی۔"

اس گاڑی کے لیے تو میں نے یہ بچہ پیدا کیا ہے۔ میری سب سہیلیوں کے پاس گاڑیاں ہیں۔ سبھی اپنی اپنی گاڑیوں پہ اٹھلا کر چڑھتی ہیں اور بات بات میں گاڑی کا رعب جتاتی ہیں۔

حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ ان میں سے دو نے اسی طرح گاڑیاں حاصل کی تھیں جس طرح میں نے حاصل کی ہے۔۔۔۔ سو ہاؤ کڈ آئی ٹولریٹ اِٹ؟ میں نے بھی اس بزنس مین سے دوستی کر لی جو دو سال سے میرے پیچھے پڑا ہُوا تھا۔

اس گاڑی کے لیے تو میں نے یہ بچہ پیدا کیا ہے اور تم چاہتے ہو کہ میں یہ گاڑی تمہیں دے دوں؟ آیو مَنٹس

وہ لڑکی واقعی مجھ سے خفا تھی۔

اس کا سفید شفاف چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ وہ میری طرف اتنی نفرت

سے دیکھ رہی تھی جیسے میں نے اس سے اس کی کار نہ مانگی ہو بلکہ اس کی عصمت مانگ لی ہو۔ وہ بار بار اپنا نچلا ہونٹ چبا رہی تھی . . . . میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر بعد جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہُوا تو اس نے اپنے ناخن میری زخمی کلائی سے باہر نکال لیے۔ پلکیں گالوں پر گرا لیں۔ اور بڑی کمزور آواز میں بولی:

"یہ گاڑی تو میں تمہیں نہیں دے سکتی اور تم جو چاہو . . . ." میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی ترکیب ہو جائے جس سے تمہاری جیسی مائیں بچے نہیں، بے بی آسٹین جنا کریں۔ ریڈیو جنا کریں، ریفریجریٹر جنا کریں۔ اگر ایسا ممکن ہو تو اس دنیا میں حرامی بچوں کی تعداد ایک حد تک کم ہو جائیگی۔"

یہ کہہ کر میں نیچے اترا اور اس گاڑی کا دروازہ زور سے بند کر دیا۔ پھر جلدی جلدی سے اپنے پالنے والے اڈے کی طرف چلا گیا۔

شام تک کوئی نہ آیا۔

پالنا خالی رہا۔

رات کا اندھیرا بڑھتا گیا اور دل کا سناٹا گہرا ہوتا گیا۔

گلی کے کالے اور پھٹے ہوئے ہونٹوں میں بجلی کے دو چار پیلے پیلے بلب مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔

نو بجے کے قریب جب مجھے زور کی بھوک لگی تب میں نے گھر کی طرف

چلنے کی ٹھانی۔

اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک میلے کچیلے لبادے میں لپٹی ہوئی ایک مریل سی عورت اس پالنے کے سامنے آکر رکی۔ پھر اس نے جھک کر اپنے لبادے میں سے کچھ نکالا اور اس پالنے میں رکھ دیا۔

وہ دیر تک وہاں کھڑی رہی، پھر دھیرے دھیرے واپس ہونے لگی سر جھکائے ہوئے۔

میں اس کا پیچھا کرنے والا ہی تھا کہ اس اندھیری چھایا میں وہ عورت پلٹتی ہوئی دکھائی دی۔

واپس آکر بچے کو اٹھایا اور گلے سے لگایا۔ پھر واپس چل دی۔

گلی کے موڑ پر پہنچ کر وہ پھر پلٹی۔ جلدی سے آکر اس نے بچے کو پھر پالنے میں رکھ دیا۔ اور تیز قدموں سے گلی سے باہر بھاگ گئی۔

سنگھ برادرس کے موٹر مرمت کرنے والے گیرج کے پیچھے سے جو راستہ لال قلعہ کی فصیل کو جاتا ہے، ادھر جاتے جاتے میں نے پیچھے سے جھک کر چلنے والی عورت کا لبادہ کھینچ لیا۔

میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ میں جسے عورت سمجھ رہا تھا وہ ادھیڑ عمر کا مرد ہے۔

اس کے چہرے پر کئی دن کی بڑھی ہوئی داڑھی تھی اور اس کی آنکھیں رو رو

کر سو چی ہوئی تھیں۔

میں نے اس سے سخت لہجے میں پوچھا۔

"تم کس کا بچہ اس پالنے میں چھوڑ کر آئے ہو؟"

کچھ لمحے وہ میری طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔

"مجھے معاف کر دو حوالدار جی!"

اس نے شاید مجھے سی آئی ڈی کا کوئی افسر سمجھا تھا۔

تبھی اس طرح گڑگڑا کر معافی مانگ رہا تھا۔

میں نے بھی اس کی غلط فہمی کو دور کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ پھر سختی سے پوچھا۔

"کس کا بچہ ہے وہ، فوراً بتاؤ؟"

"میرا بچہ ہے۔"

"کیا حرام کا بچہ ہے؟"

"نہیں مائی باپ۔"

"میری بیوی کا بچہ ہے۔"

"تیری بیوی کا بچہ ہے، تو پھر تو اس پالنے میں کیوں چھوڑ آیا ہے؟"

تیری بیوی کیسی ماں ہے، اس نے تجھے اس بات کی اجازت کیسے

دے دی؟"

"میری بیوی مرچکی ہے حضور، دس دن ہوئے ایک مہینہ کا بچہ چھوڑ کر مرگئی۔
گھر میں جو کچھ تھا وہ اس کے کریا کرم پر لگ گیا۔ چھ مہینے سے بیکار ہوں،
کہیں کوئی کام نہیں ملتا۔
گھر میں پانچ بچے ہیں۔ یہ چھوٹا ایک مہینہ کی ننھی سی جان کل رات سے
بھوک سے بلک رہا تھا۔
تین دن سے گھر میں فاقہ ہے۔ مگر کسی نہ کسی طرح ہم اس کے لیے
دودھ لاتے رہے تھے۔ لیکن کل رات سے اس کے لیے دو گھونٹ دودھ
بھی نہیں مل سکا۔
یہ کیسی دنیا ہے مالک؟ یہاں ننھے بچے کے لیے دودھ بھی نہیں
ہے۔
تین دن سے میرے سب بچے میرے ساتھ فاقے کر رہے ہیں وہ
مرجائیں گے۔ میں جانتا ہوں، وہ مرجائیں گے۔ میں بھی مرجاؤں گا۔
میں نے سوچا۔ یہاں اس یتیم خانے میں یہ سب لوگ اس کی پرورش تو
کرسکیں گے، اس لیے ایک ماہ کی اس ننھی سی جان کو پالنے میں ڈال آیا
ہوں۔۔۔۔۔۔"
"تمہیں معلوم ہے وہاں وہ کیسے رہے گا؟ اپنے ماں باپ کے ہوتے

ہوئے بھی ساری زندگی بنا ماں باپ کا کہلائے گا۔

"مگر وہ زندہ تو رہے گا حوالدار جی! زندہ تو رہے گا"

اس بڈھے نے ڈبڈباتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

آدھی رات!

پالنا خالی ہے، انسان کے دل کی طرح، انسان کی بھوک کی طرح،

میں بہت تھک گیا ہوں اور جو کچھ میں نے دیکھا ہے، اسے دیکھ کر گھر بھی جانا نہیں چاہتا۔

میں اسی پالنے میں گر کر سو جانا چاہتا ہوں۔ مگر یہ پالنا بہت چھوٹا ہے اور ہمارے گناہ بہت بڑے ہیں ؎

کُتّوں کے لیے بھی

فیملی پلاننگ

کتّا پلاننگ

سب سے پہلے ڈپٹی منسٹر نے فیملی پلاننگ کے منسٹر سے کہا۔
"آپ نے آج کا اخبار دیکھا ہے؟"
فیملی پلاننگ کے افسر نے ایک لمبی جمائی لے کر کہا۔
"آج کون سی تاریخ ہے؟
"۴ ۲ جنوری۔"
"گڈ گاڈ! کیسے دن گزر جاتے ہیں کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔"
فیملی پلاننگ کے افسر نے ایک لمبا سگار اپنے منہ میں لے کر کہا۔
"ابھی کل ہی تو نیا سال شروع ہوا تھا۔ کیسی عمدہ پارٹی تھی، آپ کو یاد ہوگا۔ مسز من سکھانی کتنی خوبصورت ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔"
"آج کے "ٹائمز" میں صفحہ سات پر ایک اہم خبر ہے۔"
ڈپٹی منسٹر نے پھر یاد دلایا۔

"میں صرف وہی اخبار پڑھتا ہوں جس میں میری تقریر چھپتی ہے اور ابھی دو دن سے میں نے کوئی تقریر نہیں کی۔ لہٰذا کوئی اہم خبر کیا ہو سکتی ہے؟"

منسٹر ایک طویل کش لگاتے ہوئے بولے۔

ڈپٹی نے خبر پڑھ کر سنائی۔

"علی آباد کے مقام پر جو جام نگر سے نو میل کے فاصلے پر ہے، ایک ایسا تجربہ کیا جا رہا ہے جس سے کتوں میں فیملی پلاننگ ہو سکے گی۔"

اس پراجیکٹ کے شروع کرنے والے ہیں کہ کتوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکا جائے۔

کیوں کہ اس علاقے کے لوگ کتوں کو جان سے مار دینے کے حق میں نہیں رہیں۔

محکمہ حفظانِ صحت میونسپل ڈیپارٹمنٹ کی مدد سے یہ پراجیکٹ شروع کرے گا جس کے ذریعے ایک محدود علاقے کے کتوں کو آپریشن کے ذریعہ نامرد بنا دیا جائے گا۔

"احمق!"

فیملی پلاننگ کے منسٹر نے خبر سن کر کہا۔

انسانوں میں فیملی پلاننگ تو ٹھیک طرح سے ہو نہیں رہی۔ تو کتوں میں کیا ہوگی بے کار میں پبلک کا روپیہ ضائع ہو جائے گا۔"

"بالکل درست ہے۔"

ڈپٹی منسٹر نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "خود میں نے یہی سوچا تھا مگر پھر خیال آیا کہ ہمارے ہاں بھی تو فیملی پلاننگ کامیاب نہیں ہے اور نئے بجٹ کے موقع پر کسی نئی کارگزاری دکھانے کی بھی ضرورت محسوس ہوگی، اسی لیے میں نے اس خبر کو اس قدر اہم سمجھا ہے۔"

ڈپٹی منسٹر چپ ہو گیا۔

"ہوں۔"

فیملی پلاننگ کے منسٹر ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ کافی غور و خوض کے بعد بولے۔

"خیال برا نہیں ہے، آخر صوبے میں کتے تو ہوں گے۔"

"ضرور ہوں گے۔"

ڈپٹی منسٹر نے کہا۔

"گو میں نے آج تک کسی کتے کا انٹرویو نہیں دیا، انسانوں ہی سے فرصت نہیں ملتی . . . . . . مگر ہوں گے ضرور۔ کیا خیال ہے؟"

"چیف سیکرٹری سے مشورہ کیا جائے اس معاملہ میں؟"

جواب میں فیملی پلاننگ کے منسٹر نے چیف سیکرٹری کو فون کر کے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

چیف سیکرٹری خبر پڑھ کر اور تجویز سن کر خاموش ہو گیا۔
کسی مسئلے پر رائے دینے سے پہلے وہ خاموش رہنا پسند کرتا تھا، چاہے وہ وزیروں کے عقل کی ہو یا کتوں کا مستقبل ہو۔
ایک لمبے سکوت کے بعد وہ بولا۔
"کتوں سے میری ملاقات زیادہ نہیں ہے، کیوں کہ مجھے شروع ہی سے طوطے پالنے کا شوق رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس سلسلے میں اگر جائنٹ سیکرٹری سے بھی مشورہ کر لیا جائے تو بہتر ہو گا۔
ان کے گھر میں پانچ کتے ہیں۔"
جب جائنٹ سیکرٹری کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی تو وہ چوکنّا ہو کر کہنے لگا۔
"صاحب جن کتوں کو میں جانتا ہوں وہ بڑے ارسٹوکریٹ قسم کے ہیں۔
میں نے ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک ملازم رکھا ہوا ہے۔
میرے کتے وقت پر سوتے ہیں، وقت پر جاگتے ہیں، وقت پر نہاتے ہیں، وقت پر کھانا کھاتے ہیں، وقت پر سیر کو جاتے ہیں، اپنی سوجھ بوجھ میں وہ تقریباً انسان ہیں۔
ایسے ارسٹوکریٹ کتوں کی فیملی پلاننگ پر بہت زیادہ خرچ اٹھے گا۔

"ارے بھائی!"

ڈپٹی منسٹر بولے۔

"ہم کوٹھیوں کے کتوں کی بات نہیں کرتے۔ظاہر ہے انہیں کسی فیملی پلاننگ کی ضرورت نہیں ہے، چاہے وہ انسان ہوں یا کتے؟

لیکن اگر وہ کسی کوٹھی یا بنگلہ میں رہتے ہیں تو اس پلاننگ کی زد میں نہیں آتے۔

یہاں بات بازاری کتوں کی ہو رہی ہے۔میرا مطلب کتوں کی عام جنتا سے ہے۔

"میرا خیال ہے۔"

جوائنٹ سیکریٹری بولے۔

"انڈر سیکریٹری صاحب کو بلا لیا جائے۔میں تو سول لائنز میں رہتا ہوں وہ شہر میں رہتے ہیں۔

بازاری کتوں کے بارے میں ان کی جانکاری زیادہ ہوگی۔

انڈر سیکریٹری جب اس کانفرنس میں شریک ہوئے تو تجویز سنتے ہی اچھل پڑے۔

کیونکہ اپنی زندگی میں کئی مرتبہ بری طرح کتوں سے پٹ چکے تھے اور ایک دفعہ حلوائی کے کتے نے انہیں اس زور سے کاٹ لیا تھا کہ ابھی تک

ٹخنے کے قریب اس زخم کا نشان باقی تھا۔

"میرا اندازہ ہے اس اکیلے شہر میں دو لاکھ کتے ہوں گے اور اتنی ہی کتیا ہوں گی۔

اب اگر ایک کتیا سال میں پانچ بچے بھی دے اور ان میں سے صرف تین بچے بھی زندہ رہیں تو سمجھئے ہر سال کتوں کی تعداد دگنی ہو جاتی ہے۔

اجی صاحب!

میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر اس شہر میں کتے اسی رفتار سے بڑھتے رہے تو دس سال کے عرصے میں اس شہر میں کتوں کی آبادی انسانوں کی آبادی سے زیادہ ہو جائے گی۔

ہمیں ضرور اس سلسلے میں کوئی فوری قدم اٹھانا چاہیئے۔ ذرا سوچئے تو سہی ان لاکھوں کتوں پر کتنا اناج ضائع ہوتا ہے، کتنی بیماریاں پھیلتی ہیں، کتنی سڑکیں گندی ہوتی ہیں، کتنے انسان ہائیڈروفوبیا سے مر جاتے ہیں۔ کتا انسان کا بدترین دشمن ہے حضور!

میرا تو اندازہ ہے سرکار کہ کتوں کی فیملی پلاننگ کر دی جائے تو انسان کی فیملی پلاننگ کی ضرورت ہی نہ رہے۔"

"ہیئر! ہیئر!!"

وزیر اعلیٰ تالی بجا کر بولے۔

"میں بالکل یہی سوچ رہا تھا اور اسی خیال کے تحت میں نے تم لوگوں کو اس کانفرنس میں شریک کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بات بالکل واضح اور صاف ہو چکی ہے اور جیسا کہ میں نے شروع میں سوچا تھا، ہمیں فوراً کتوں کی فیملی پلاننگ کی یوجنا شروع کر دینی چاہیئے۔

اور جیسا کہ ابھی میں نے کہا ہے کہ اگر کتوں کی فیملی پلاننگ کامیاب ہو گئی تو ہمیں انسانوں کی فیملی پلاننگ کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ آپ لوگ اس خیال کو مدنظر رکھ کر یہ یوجنا شروع کیجئے اور سب سے پہلے اس کے بارے میں ایک پمفلٹ شائع کیجئے جس کے سرورق پر ایک طرف میری تصویر ہو۔

"اور دوسری طرف ایک کتے کی"

ڈپٹی منسٹر نے تجویز پیش کی۔

منسٹر اعلیٰ نے گھور کر ڈپٹی منسٹر کی طرف دیکھا۔ پھر فوراً ہی بولے۔

"آں، ہاں، نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، صرف میری تصویر ہی کافی ہے۔"

"لیکن ایک پمفلٹ شائع کرنے سے کام نہ چلے گا۔"

چیف منسٹر نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے لیے ہمیں بجٹ منظور کرنا پڑے گا اور نیا اسٹاف رکھنا پڑیگا آخر وہی لوگ جو انسانوں کی فیملی پلاننگ کرتے ہیں۔ کتوں کی فیملی پلاننگ میں کام

نہیں کر سکتے۔ انسانوں اور کتوں کی عادات میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔"

"اب کچھ ایسا بھی فرق نہیں ہوتا ہے۔"

ڈپٹی منسٹر بولا۔

"نہیں، نہیں، انڈر سیکرٹری ٹھیک کہتا ہے۔"

منسٹر بولے۔

"ہمیں اس کے لیے بالکل نیا بجٹ اور نیا اسٹاف رکھنا پڑے گا۔ سب سے زیادہ اس امر کی ضرورت ہے کہ اس یوجنا کا انچارج ایک ایسا آدمی ہو جو کتوں کے بارے میں مکمل واقفیت رکھتا ہو۔"

انڈر سیکرٹری بولا۔

"میرا ایک بھتیجا ہے۔"

جائنٹ سیکرٹری بولا۔

"میرا ایک بھائی ہے۔"

"چیف سیکرٹری بولا۔

"میرا نواسا ہے۔"

وزیر بولا۔

"میرا ایک داماد ہے۔"

وزیر صاحب کے بعد پھر کوئی نہیں بولا۔ وزیر نے آخری سچائی کہہ دی تھی

اور سچائی کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے — چنانچہ مجھے دوسرے دن ہی سے نوکر رکھ لیا گیا۔

(۲)

وہ لوگ بکواس کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مجھے اس لیے نوکری مل گئی کہ میں منتری کا داماد تھا۔ میں دراصل اس کام کے لیے نہایت ہی موزوں آدمی ہوں۔ ایک تو میں جانوروں کا وٹرنری ہوں۔
یعنی ڈنگر ڈاکٹر ہوں۔

جانوروں کی نفسیات کے بارے میں جتنا علم مجھے ہے اور کسی کو نہ ہوگا۔ پھر میں جانوروں کی بولی سمجھتا ہوں اور اس زمانے میں جب کہ بیٹا باپ کی بولی نہیں سمجھتا، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔

دو اردلیوں، دو خلاصیوں، دو کمپاونڈروں اور ایک چلتی پھرتی آپریشن گاڑی سے لیس ہو کر میں نے ایک کتے کو گلی کے نکڑ پہ جا گھیرا جو ایک کتیا کے پیچھے پیچھے بھاگا جا رہا تھا۔

کتے نے ہم سب کی طرف غور سے دیکھا۔ آخر وہ سمجھ گیا کہ ان سب میں سے صرف میں ہی اس سے بات کرنے کا اہل ہوں۔

لہٰذا وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

اس نے پوچھا۔

"میں تمہارا آپریشن کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے اسے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"تاکہ تم مزید بچے پیدا نہ کرسکو۔"

"ہمارے بچوں سے تمہیں کیا پریشانی ہوتی ہے؟"

"ان کے لیے ہم کھانا کہاں سے لائیں گے؟"

میں نے کتے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اس شہر میں دو لاکھ کتے ہیں۔ اگلے پانچ سال میں دس لاکھ ہو جائیں گے
ہم ان دس لاکھ کتوں کے لیے کہاں سے غذا لائیں گے۔

اپنے بچوں کا ہی پیٹ بھرنا مشکل ہو رہا ہے، اس لیے تمہارا آپریشن
ہوگا۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

کتے نے کہا۔

"میں کب منع کرتا ہوں۔ اگر ہماری نسل کشی سے انسانی نسل کا مستقبل محفوظ
ہے تو کتنے انسان کی خاطر یہ قربانی بھی دے دیں گے۔

لیکن اگر ذرا غور سے میری بات سنو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ بیکار کا بکھیڑا
پال رہے ہو۔ کتوں کو ختم کر دینے سے تمہارا کوئی لابھ نہ ہوگا۔"

"وہ کیسے ؟"

"کتوں کو ختم کر دینے سے بلیوں کی تعداد بڑھ جائے گی اور تمہیں معلوم ہے بلیاں کتنی جلدی جلدی بچے دیتی ہیں ؟"

اور ہم لوگ تو پھر بھی تمہاری جوٹھن پر گزارا کرتے ہیں، بلیاں تو سیدھی تمہارے کچن میں گھس کر زبردستی سے دودھ پی جاتی ہیں۔

"کچھ معلوم بھی ہے۔"

کتے نے بات معقول کہی تھی۔

چنانچہ میں نے یہ روداد اپنے ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسروں کے سامنے رکھی، تو ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ فی الحال کتوں کی فیملی پلاننگ ملتوی کر کے بلیوں پر حملہ کیا جائے۔

چنانچہ مجھے نئے آرڈر دیے گئے، نیا عملہ دیا گیا، نیا بجٹ منظور کیا گیا جس میں سے پھر ایک نیا پمفلٹ شائع کیا گیا۔

نام تھا۔

"بلیوں کی فیملی پوجنا۔"

آٹھ دس روز کی کوشش کے بعد ہم لوگ ایک موٹے تازے بلے کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔

وہ پہلے تو بہت دیر تک ہمیں دیکھ کر غراتا رہا اور پنجے نکال نکال کر خرخر

کرتا رہا۔

آخر میں بے حد غصہ سے مجھے گھور کر بولا۔

"میاں تمہیں جانتے نہیں ہو، میری جو بیوی ہے وہ وزیرِ تعلیم کی پالتو بلی ہے۔

اپنی نوکری چاہتے ہو تو مجھے فوراً چھوڑ دو۔ ورنہ شکایت کر دوں گا"

مجھے بھی غصہ آگیا میں نے کہا۔

"میاں بلے! تم ہو کس خیال میں۔"

اگر تمہاری بیوی ایک وزیر کی بلی ہے تو میں بھی ایک وزیر کا داماد ہوں۔

میں تمہارے وزیر کا دبیل نہیں ہوں جو تم سے ڈر جاؤں گا"

اس پر وہ مغرور بلا کچھ ڈھیلا پڑا، پوچھنے لگا۔

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

اس پر میں نے اسے اپنی اسکیم سمجھائی۔ اسکیم سن کر وہ بولا۔

"تو تم نے انسانوں کی فیملی پلاننگ کو کتوں کی فیملی پلاننگ میں بدل دیا اور اب کتوں کی فیملی پلاننگ کو بلیوں کی فیملی یوجنا میں بدل دینا چاہتے ہو تاکہ اس دنیا میں بلیاں تمہارے بچوں کی غذا نہ ہڑپ کر جائیں۔"

"بالکل ٹھیک کہتے ہو تم، یہی خیال ہمارا ہے۔"

میں نے اس مغرور بلے کو نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہم تو تمہاری جان نہیں لینا چاہتے۔"

"ہم عدم تشدد پر یقین رکھتے ہیں اور اس آپریشن سے تمہیں کوئی خاص تکلیف بھی نہ ہوگی۔ بس ذرا دو منٹ کے لیے تھوڑی سی تکلیف ہوگی اور اس کے بعد آٹھ دن تک تمہیں ہر روز ایک گولی کھانی ہوگی نہار منہ ناشتے سے پہلے۔"

"بہت اچھا۔"

"بلا بولا۔

"انسانی آبادی کو محفوظ مستقبل کے لیے ہم لوگ اپنے بچوں کا مستقبل ختم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر بس اتنا یاد رکھو کہ اگر تم نے ہمیں ختم کر دیا تو تمہارے بچوں کا مستقبل پہلے سے زیادہ خطرے میں پڑ جائے گا۔"

"وہ کیسے؟"

میں نے بلے سے پوچھا۔

وہ بولا۔

"یہ سوچو کہ اگر اس دنیا میں بلیاں نہ رہیں گی تو پھر چوہوں کا کیا ہوگا۔ آج بھی انسان کی خوراک کا چوتھا حصہ چوہے کھا جاتے ہیں اور اس کے عوض کیا دیتے ہیں تمہیں؟ پلیگ۔ سوچو اور غور کرو اگر ہم بلے نہ ہوں تو اکیلے اسی شہر میں ایک سال میں ایک کروڑ چوہے بڑھ جائیں۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔"

میں نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔

"اس لیے اگر تم جانوروں ہی کی فیملی یوجنا شروع کرنا چاہتے ہو تو چوہوں سے شروع کرو۔"

جب اس عقلمند بلے کی بات میں نے وزیر صاحب کو سمجھائی تو فوراً کرسی سے اچھل پڑے۔

بولے۔

"میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا، بالکل ٹھیک کہتا ہے وہ بلّا۔"

ایک بار پھر ہم لوگوں نے اپنی اسکیم بدل دی۔ نیا اسٹاف رکھا گیا۔ نیا بجٹ منظور کیا گیا، نیا پمفلٹ چھپ گیا۔

"چوہوں کی فیملی یوجنا"

اس دفعہ ہم سب لوگ بالکل مطمئن تھے کہ اب کی ہم ٹھیک راستے پر ہیں اور اب سب کام قاعدے سے ہوگا اور جلدی ہوگا۔

مگر بہت جلد ہمیں معلوم ہو گیا کہ اس کام میں تو بہت دشواری ہے۔ سب سے پہلے تو ہمارا جھگڑا میونسپل کارپوریشن کے کارندوں سے ہوا۔ جب ہمارے عملے کے لوگ چوہے پکڑنے لگے۔ تاکہ ان کا آپریشن کیا جا سکے۔ تو ہمیں معلوم ہوا کہ شہر کے تمام چوہے میونسپل کارپوریشن کے قبضہ

میں ہیں اور ہمارا تو ان پر کوئی حق نہیں ہے اور جب تک میونسپل کمیٹی اجازت نہ دے ہم قانونی طور پر ایک چوہے کا بھی آپریشن نہیں کر سکتے۔

اس پر ہمیں بہت غصہ آیا۔ ہمارے محکمے کے وزیر نے کارپوریشن کے میئر کو لکھا اور میئر نے محکمے کے وزیر کو لکھا۔

اس طرح کئی مہینے گزر گئے۔

کارپوریشن والے چاہتے تھے کہ شہر کے چوہے ہمارے حوالے نہ کیے جائیں بلکہ سیدھے سیدھے مار دیے جائیں۔

جیسا کہ اب تک ہوتا چلا آیا تھا اور ہم چاہتے تھے کہ چوہوں کو جان سے مارنے کے بجائے ان کا آپریشن کر دیا جائے تاکہ مزید چوہے پیدا نہ ہو سکیں اور ہماری فیملی یوجنا کامیاب ہو۔

ڈیڑھ سال تک یہ جھگڑا چلتا رہا۔

آخر میں اوپر سے یہ فیصلہ ہوا کہ پہلے کارپوریشن چوہوں کو جان سے مار دے بعد میں وہ چوہے ہمارے حوالے کر دیئے جائیں تاکہ ہم ان کا آپریشن کر دیں۔

اوپر والوں نے دونوں محکموں کی بات رکھ لی تھی۔

مگر مردہ چوہوں کا آپریشن کرنا بے کار ہوتا، اس سے ہماری یوجنا خطرے میں پڑ جاتی۔ لہٰذا ہمارے وزیر صاحب نے مجھے ملا کر سمجھایا۔

"بیٹا جھگڑا کرنے سے کیا فائدہ، شہر کا میئر بھی اپنا آدمی ہے۔ یہ اس کی پرسٹیج کا معاملہ ہے اگر وہ شہر کے چوہے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے تو رکھ لے، تم دیہات میں جاؤ۔ میں نے سنا ہے کہ گاؤں میں چوہے ہوتے ہیں۔"

"ہوتے تو ہیں۔"

میں نے کہا۔

"مگر شہر سے ڈبل ہوتے ہیں، بہت بڑے ہوتے ہیں اور بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ مجھے اس کے لیے اور اسٹاف چاہیئے۔"

"اور اسٹاف بھی لے لے۔"

"گاؤں میں جانے کے لیے دو جیپیں چاہئیں۔"

"دو جیپیں بھی لے لے۔ مگر اب شہر کے چوہوں کا خیال چھوڑ دے اور دیہات کے چوہوں کی طرف رخ کر۔"

میں نے کہا۔

"شہر کے چوہے بڑے مہذب ہوتے ہیں۔ فیملی یوجنا کی بات بہت جلد ان کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ مگر اب ان گنوار دیہاتی چوہوں کو سمجھانے کے لیے مجھے زیادہ پروپیگنڈا کرنا پڑے گا۔"

"ایک اور نیا پمفلٹ چھپوا لے تو۔ ان دنوں میری ایک نئی تصویر بھی آئی ہے۔"

وزیر نے مجھے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

ایک دن جب سامان مکمل طور پر تیار ہو گیا تو ہم لوگ کیل کانٹے سے لیس ہو کر باہر دیہات میں چوہوں کی فیملی پوجنا شروع کرنے کے لیے گئے۔

مگر گاؤں والوں نے ہمیں کھیتوں کے نزدیک بھی نہ جانے دیا۔

وہیں سڑک کے کنارے روک دیا اور لاٹھیاں لے کر کھڑے ہو گئے۔

ان کا سردار بولا۔

"چوہوں کی فیملی پوجنا؟"

کیا احمق ہو، جانتے نہیں ہو کہ اگر چوہے ہمارے کھیتوں میں نہ رہیں تو ہمارے کھیتوں کی آدھی فصل کیڑے مکوڑے کھا جائیں۔

یہ تو چوہے ہیں۔ جو دن رات ہمارے کھیتوں میں بل بنا کر ان کیڑے مکوڑوں کو کھاتے رہتے ہیں اور ہماری فصل کو تباہی سے بچاتے رہتے ہیں۔

ہم ان کی پوجنا نہ ہونے دیں گے، ہر گز ہرگز نہ ہونے دیں گے۔

"بھاگ جاؤ"

"عجیب مصیبت ہے۔"

میں نے اپنے دل سے کہا۔

اگر ہم کتوں کی پلاننگ کرتے ہیں تو بلیاں بڑھ جاتی ہیں۔ بلیوں کی روک تھام کرتے ہیں تو چوہے بڑھ جاتے ہیں، چوہوں کو ختم کرتے ہیں تو کیڑے مکوڑے بڑھ جاتے ہیں۔

کریں تو کیا کریں؟

ہم وہاں سے تو بھاگ گئے۔ مگر کسی کے ڈرانے دھمکانے سے بھلا ہماری فیملی یوجنا کا کام رک سکتا ہے؟

یہ تو سرکاری کام ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ ایک یوجنا نہ ہو گی تو اس کی جگہ دوسری یوجنا ہوگی۔

چنانچہ اب ہمارے محکمے کی طرف سے بہت جلد کیڑوں مکوڑوں کی فیملی یوجنا شروع ہونے والی ہے۔

اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے مخالفین نے ابھی سے یوجنا شروع کر دیے ہیں۔

محکمہ زراعت نے ایک زبردست پروٹسٹ نوٹ میں لکھا ہے۔

کہ وہ ریشم کے کیڑوں کی فیملی یوجنا کبھی نہ ہونے دیں گے اور بہت سے سرکاری افسروں نے اس کی تائید کی ہے۔

غالباً یہ سوچ کر کہ سرکاری افسر بھی ایک طرح سے ریشم کے کیڑے ہی ہوتے ہیں۔

مگر بھلا کسی کے ڈرانے دھمکانے سے ہماری فیملی یوجنا کا کام رک سکتا ہے؟

نیا پمفلٹ چھپ رہا ہے۔

نیا بجٹ منظور ہو چکا ہے۔
نیا عملہ رکھا جا چکا ہے اور اس سال تو میں نے بھی اپنی تنخواہ خاص طور پر بڑھوالی ہے کیوں کہ میرے گھر میں خوشی ہونے والی ہے۔

ملکہ کی آمد

شیطان ٹائمز کے ایڈیٹر نے مجھ سے کہا۔
"تم سیدھے پالم چلے جاؤ اور ملکہ کی استقبالیہ تیاریوں کے سلسلے
کی پوری رپورٹ مجھے لاکر دو۔"
شیطان ٹائمز کے دفتر میں میری ملازمت کا یہ پہلا دن تھا۔ بڑی سفارش
کے بعد مجھے رپورٹر لیا گیا تھا۔
یہ درست ہے کہ اس سے پہلے میں نے کسی اخبار میں کام نہیں
کیا تھا!
مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟
کالی عینک والے گنجے ایڈیٹر نے مجھے ہمدردی سے سمجھاتے
ہوئے کہا۔

"اخبار کا رپورٹر تو پیدائشی رپورٹر ہوتا ہے۔ اس کی ناک اس قدر تیز ہوتی ہے کہ وہ جنگل میں خبر سونگھ سکتا ہے۔"

میں نے خبر سونگھنے کے لیے اپنے نتھنے پھیلائے۔

"عامیانہ قسم کی رپورٹنگ تو ہر رپورٹر کر سکتا ہے لیکن اگر ترقی کرنا چاہتے ہو تو دھانسو قسم کی رپورٹنگ کرو۔ اک دم سنسنی خیز، اک دم دھانسو"

ایڈیٹر نے اپنا مکّا ہوا میں لہرایا۔

جواب میں مَیں نے بھی اپنا مکا ہوا میں لہرایا۔

"شاباش!"

"اب تم جا سکتے ہو۔"

ایڈیٹر یکایک اپنی کرسی پر بیٹھ گیا جیسے اس کی ساری انرجی ختم ہو چکی ہو۔

"جاتے جاتے کینٹین سے میرے لیے ایک چائے بھجواتے جاؤ۔"

میں ابھی پالم ائیرپورٹ پر پہنچا بھی نہ تھا۔ کہ میں نے اسے پالم کے قریب کے کھیتوں میں دیکھ لیا۔ وہ ایک بہت بڑے نیم تلے کنوئیں کے قریب کھڑی اپنے بیلوں کو پانی پلا رہی تھی۔

دراز قد، گورا رنگ، شاہانہ وقار۔ ۔ ۔ ۔ میں تو اسے دیکھتے ہی مبہوت ہو گیا اور ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگا۔

چند لمحوں کے لیے تو اس نے مجھے دیکھنے دیا۔ پھر اس نے بلیوں کو مارنے والی سونٹی اٹھائی اور میں نے چونک کر اس سے پوچھا۔

"تمہارا نام ۔۔۔؟

وہ بولی۔

"میرا نام ملکہ ہے ۔۔۔!"

"ملکہ ۔۔۔۔؟"

"ہاں ملکہ ۔۔۔۔!"

"کتنے بچے ہیں تمہارے؟"

"تین!"

میرا دل دھڑکنے لگا، یہ وہی ہے، بالکل وہی ہے، عین سن وہی صورت وہی، وہی وقار، وہی رعب، وہی شاہانہ انداز۔

میں نے سامنے کے وسیع کھیتوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"کیا یہ ۔۔۔ یہ سب کھیت تمہارے ہیں؟"

"ہاں"

"یہ سامنے تمہیں جتنے کھیت نظر آتے ہیں ہمارے ہیں۔"

وہ شاہانہ تمکنت سے بولی۔

"وہی ہے، بالکل وہی ہے۔"

میرے دل نے گواہی دی اور میں فوراً ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے سامنے دوزانو ہو گیا اور سر جھکا کر مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

"ملکہ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"کون؟"

"دلی شہر والے ..... دلی شہر کے لوگ آج تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"مگر میں تو آج تک دلی شہر نہیں گئی۔ وہاں کسی کو نہیں جانتی۔"

دلی شہر کبھی نہیں گئیں ..... تو تو یہ بالکل وہی ہے .... بالکل وہی ہے۔ میرے دل نے تقریباً چیخ کر مجھ سے کہا۔

"مگر میرے کھیتوں کا اناج وہاں جاتا ہے اور میرے کھیتوں کی سبزی ترکاری بھی۔"

وہ خود ہی بول پڑی۔

"دلی شہر کے لوگ بڑے نمک حلال ہیں ملکہ، انہوں نے برسوں تمہارا نمک کھایا ہے، تمہاری روٹیاں توڑی ہیں، تمہاری سبزی ترکاری استعمال کی ہے۔ اور آج وہ سب لوگ تمہارا سواگت کرنے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں۔ وزیروں سے لے کر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تک ہر شخص تمہیں ایک پل دیکھ لینے کے لیے بے قرار ہو رہا ہے۔"

"مجھے ....."

وہ ہنسی اور اس نے اپنی پتلی چھڑی اپنے موتیوں کی طرح سپید دانتوں میں داب لی۔ اور بولی۔

"مجھے بھلا وہ کیوں دیکھنا چاہیں گے۔"

"کیوں کہ تم ملکہ ہو۔"

میں نے دونوں ہاتھوں کو زور سے پھیلا کر اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلّا کر کہا۔

"اور آج دلی تمہارے شاہانہ استقبال کے لیے دلہن کی طرح سجی بنی کھڑی ہے۔"

اسے میری بات کا یقین آ گیا۔

بیلوں کو نیم کے پیڑ سے باندھ کر بولی۔

"بچوں کو بھی لے چلوں؟"

"ہاں۔ ہاں۔ کیا مضائقہ ہے۔"

میں نے کہا۔

"تینوں شہزادوں کو ساتھ لیتی چلو، دلی والوں کے دل میں ملکہ کے شہزادوں کے لیے بڑی عزت ہے۔"

جب ہم پالم سے پیدل چل کر دلی گیٹ پہنچے تو تینوں شہزادے بہت تھک چکے تھے۔ ایک تو تقریباً لنگڑا رہا تھا، دوسرے کو ملکہ نے اٹھا رکھا

تھا، تیسرے کو میں نے اپنے کندھے پر جگہ دی تھی۔

اتفاق سے دلی گیٹ پر مجھے اپنی پہچان کا ایک اسکوٹر والا مل گیا۔ وہ ہمیں نہایت سستے داموں کناٹ پلیس لے گیا۔

راستے میں ارون ہسپتال کے قریب درختوں پر رنگ برنگے قمقمے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر بولے۔

"اباجی — ہم تو چمکنے والے پھل کھائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"معصوم شہزادو! یہ پھل نہیں ہیں، یہ بجلی کے ڈبے ہیں جو تمہاری آمد کی خوشی میں لگائے گئے ہیں!"

"اور یہ رنگارنگ جھنڈیاں؟" ملکہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

"سب آپ کے لیے ملکہ! سب آپ کے لیے ہے۔"

ارون ہسپتال سے آگے نکلے تو رام لیلا گراؤنڈ میں لاتعداد روشنیاں تھیں، اَن گنت مائیک تھے، ایک خوبصورت راجپوتی برجی تھی۔

"یہ کس کے لیے؟"

ملکہ نے پھر پوچھا۔

"یہ بھی آپ کے لیے۔"

میں نے عرض کیا۔

آگے چلے تو کناٹ پلیس پہنچ گئے۔ کناٹ پلیس کی سج دھج دیکھ کر ملکہ بہت خوش ہوئیں۔

یونائیٹڈ کافی ہاؤس کے قریب پہنچ کر فرمانے لگیں۔

"مجھے نہیں معلوم تھا دلی والے دل کے اتنے اچھے ہوں گے ورنہ میں بہت پہلے یہاں آتی۔ کئی بار میرے خاوند نے مجھ سے کہا، دلی چلو۔ مگر میں ہمیشہ ٹال گئی۔"

"کیوں؟"

"کھیتوں میں بہت کام تھا۔"

ملکہ بڑی سادگی سے بولی۔

"اور اب وہ کہاں ہے؟ تمہارا خاوند؟"

"آزادی کے فسادوں میں مارا گیا تھا۔ ان دنوں ہمارے گاؤں کے بہت سے مسلمان مار ڈالے گئے تھے کیوں کہ گاؤں کا چودھری ہماری زمینوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔

چنانچہ میرے خاوند کی وفات کے بعد جب وہ میرے کھیتوں پر قبضہ کرنے آیا تو میں اپنے خاوند کا کلہاڑا لے کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"جو آگے بڑھے گا اسی کا سر سب سے پہلے کٹے گا۔"

"پھر۔۔۔؟"

میں نے دل چسپی سے پوچھا۔

"پھر کیا؟"

ملکہ ان دنوں کو یاد کر کے سر سے پاؤں تک غصے کی آگ میں دہکنے لگی۔

میں اس کا شاہانہ انداز دیکھ کر کانپ گیا۔ پانچ فٹ دس انچ کی بھرپور توانا عورت میری طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے مجھے کچا ہی کھا جائے گی۔

خوش قسمتی سے میری گھبراہٹ دیکھ کر اس نے اپنا لہجہ بدل دیا۔

آہستہ سے بولی۔

"میرا غصہ دیکھ کر چودھری کا رنگ اڑ گیا اور وہ سر جھکائے میرے کھیتوں سے باہر نکل گیا۔ اور یہ بالکل سچ تھا۔ اس وقت جو بھی آگے بڑھتا میں اس کا سر بھٹا سا اڑا دیتی۔"

"پھر؟"

میں نے کانپ کر پوچھا۔

"پھر کچھ نہیں۔"

ملکہ ایک فیصلہ کُن انداز میں بولی۔

"وہ دن اور آج کا دن کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میں اکیلی عورت اس گاؤں میں رہتی ہوں، اپنے کھیتوں میں ہل چلاتی ہوں، بیج بوتی ہوں، فصل کاٹتی ہوں، اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہوں، کس کی مجال ہے جو میری طرف

یا میرے بچوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے، خون نہ پی جاؤں گی ؟"

جن پتھ کے قریب پہنچ کر شہزادوں نے منمنانا شروع کیا۔

"اوں ہوں ہمیں بھوک لگی ہے۔ ہم ریوڑیاں کھائیں گے، ہم مونگ پھلی کھائیں گے"

میں نے کہا۔

"اچھے شہزادے مونگ پھلی کھاتے ہیں نہ ریوڑیاں، اور یہ تو نئی دلی ہے، یہاں کے لوگوں نے آپ کو اس قسم کا الم غلم کھاتے دیکھ لیا۔ تو آپ کی عزت گھٹ جائے گی"

"تو ہم کیا کھائیں بھئی"

ملکہ ذرا تنک کر بولی۔

"پالم سے پیدل چلے آ رہے ہیں بھوک لگی ہے"

میں نے دست بستہ عرض کی۔

"راشٹرپتی بھون چلیئے، وہاں تو آپ کے اعزاز میں ایک بہت بڑی دعوت دی جا رہی ہے"

مگر ہمیں راشٹرپتی بھون کے باہر ہی روک لیا گیا۔

"آپ کا دعوت نامہ ؟"

دروازے پر کھڑے ایک آفیسر نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے جیب سے دعوت نامہ نکال کر دکھا دیا۔
افسر نے کارڈ پڑھا۔ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولا۔
"کیا شیطان ٹائمز کے رپورٹر آپ ہی ہیں ؟"
"جی ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ !"
اس افسر نے پھر مجھے غور سے دیکھا، کیونکہ میں سر سے پاؤں تک گرد و غبار میں اٹا ہوا تھا اور تقریباً یہی حالت ملکہ اور اس کے بچوں کی تھی۔
میں نے آنیسر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔
"میں ذرا پالم تک گیا تھا ان کو لانے کے لیے۔"
افسر نے کہا۔
"مگر آپ کا دعوت نامہ تو صرف ایک آدمی کے لیے ۔ ۔ ۔ ۔ اور آپ کے ساتھ تو ۔ ۔ ۔ ۔ !"
"جناب والا۔"
میں نے بڑے فخر سے کہا۔
"بڑی حیرت کی بات ہے آپ ان لوگوں کو پہچان نہیں رہے ہیں ۔ جو میرے ساتھ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ آج کی دعوت ان ہی لوگوں کے اعزاز میں دی جا رہی ہے۔
"کون ہیں یہ لوگ ؟"

آفیسر نے پوچھا۔

"یہ ملکہ ہیں ـــــ یہ ان کے تینوں شہزادے ہیں۔"

میں نے سینہ پھلا کر کہا۔

دو زانو ہو جاؤ مسٹر!

افسر نے مجھے پھر سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ پھر وہ مڑ کر اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"میں یہاں لوگوں کو تماشا نہیں دکھانا چاہتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم اس پگلے کو یہاں سے نکال دو۔"

(۲)

اس نے تمہیں پگلا کیوں کہا؟"

ملکہ نے بعد میں مجھ سے پوچھا۔

ہم لوگ راشٹرپتی بھون سے نکالے گئے تھے۔ اور اب پچھواڑے کے باغ سے داخل ہو کر اس سوئٹ کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں ملکہ اور ان کے عملے فیلے کے لیے ٹھہرنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔

"وہ خود پاگل تھا۔"

میں نے ملکہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اس نے تمہیں نہیں پہچانا۔ اگر پہچان لیتا تو فوراً دو زانو ہو جاتا۔ کیوں کہ

ہم لوگوں نے تمہارے کھیتوں کا اناج کھایا ہے، وزیروں سے لے کر کارندوں تک ہم سب لوگ تمہاری محنت سے زندہ ہیں۔"

"ہم بڑے نمک حلال لوگ ہیں ملکہ۔"

مگر مجھے بڑا افسوس ہے۔ اس آفیسر نے تمہیں نہیں پہچانا۔"

ایک شہزادہ بولا۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔"

دوسرا بولا۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔"

ملکہ بولی۔

"اب میں تھک گئی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"بلکہ جہاں تمہیں میں اب لے جارہا ہوں۔ وہاں کسی طرح کی غلطی نہیں ہو سکتی۔ وہاں سب لوگ تمہیں پہچانتے ہیں۔ وہاں تمہیں کھانے کو بڑھیا سے بڑھیا ملے گا۔ سونے کے لیے شاہانہ بستر، درجنوں نوکر خدمت کرنے کے لیے۔ راشٹر پتی بھون کا یہ حصہ صرف تمہارے لیے ریزرو کیا گیا ہے۔"

ملکہ نے یہ سن کر تبسم فرمایا اور پھر ملکہ اور شہزادوں کے قدم تیز ہونے لگے۔ ستونوں کی آڑ لیتے ہوئے، غلام گردشوں کے کونوں میں چھپتے ہوئے

ہم کسی نہ کسی طرح اس سوئٹ میں پہنچ گئے جو ملکہ کے لیے وقف تھا۔

کیسی خوب صورت دیواریں تھیں، کیسی منقش چھتیں تھیں۔ کتنے حسین فانوس تھے، کتنے بڑھیا اسپرنگ دار بستر تھے۔

شہزادے بستر سے چھلانگیں لگاتے اور نیچے گرتے، غالیچوں پر لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے۔

ملکہ بھی اپنے شفاف جھلملاتے بستر پر لیٹ گئیں۔ پھر اس نے ایک دل کش ادا سے انگڑائی لی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر قریب پر رکھی ہوئی چاندی کی ایک فروٹ باؤل میں ہاتھ ڈالا۔

اس فروٹ باؤل میں چمن کے انگور تھے، کابل کے سردے، بمبئی کے الفانزو، عظیم آباد کی لیچی، کشمیر کے سیب، کلو کی ناشپاتیاں، پشاور کے مالٹے قندھار کے انار، ناگپور کے سنگترے، انگلینڈ کے آڑو، ویلز کے اخروٹ اور سکاٹ لینڈ کی گھاس تھی۔ غرضیکہ ہر موسم اور ہر جگہ کا پھل اور میوہ تھا۔

ملکہ نے انگور کا ایک دانہ منہ میں رکھ کر کہا۔

"یہ دلی والے کتنے اچھے لوگ ہیں۔"

یکایک سامنے کا پردہ ہلا اور ایک معمر بٹلر نمودار ہوا اور "یور میجسٹی" کہہ کر جھکا۔

پھر جو اس نے ملکہ اور اس کے بچوں کو دیکھا تو وہ جھکے کا جھکا رہ گیا۔

اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
پھر اس کے پیچھے دو لیوبہ پین خادمائیں نمودار ہوئیں۔ جنہیں دیکھ کر انہوں نے زور سے ایک چیخ ماری اور فوراً بے ہوش ہو گئیں!

(۳۱)

ہم لوگ وہاں سے بھی نکال لے گئے لیکن گرفتار نہیں کیے گئے، وجہ صاف ظاہر ہے، وہ لوگ کسی قسم کا ہنگامہ نہیں چاہتے تھے۔
مگر اب میں بے حد خفا تھا۔
آخر یہ کس طرح کی سازش ہے؟ آخر یہ سب لوگ ملکہ کو پہچاننے سے کیوں انکار کر رہے ہیں؟
میں شیطان ٹائمز کا رپورٹر تھا۔ یہ درست ہے کہ مجھے آج ہی نوکر رکھا گیا ہے۔
مگر ایک جرنلسٹ آخر جرنلسٹ ہے۔ چاہے اس کی ایک دن کی سروس ہو یا دس برس کی!
اور ایک جرنلسٹ کی عزت اس امر کی متقاضی ہے کہ میں ملکہ کے خلاف اس سازش کو اپنے اخبار میں بے نقاب کر دوں۔
اگر ایک دفعہ ملکہ کو پولیس نے پہچان لیا تو پھر ساری دنیا کو اسے پہچاننے

میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ پریس کی طاقت بہت بڑی طاقت ہے۔
یہ سوچ کر میں ملکہ اور اس کے تینوں شہزادوں کو لے کر ایک سکوٹر میں بیٹھ کر شیطان ٹائمز کے دفتر کو روانہ ہو گیا۔

(۴)

شیطان ٹائمز کے ایڈیٹر نے مجھ سے پوچھا۔
"پالم گئے تھے؟"
"جی ہاں۔"
میں نے کامل اعتماد سے کہا۔
"پھر؟ ملکہ کو دیکھا؟"
"دیکھا کیا؟ میں اسے اپنے ساتھ لایا ہوں!"
"اپنے ساتھ؟ یہاں؟"
شیطان ٹائمز کا ایڈیٹر تقریباً چیخ کر بولا۔
"جی ہاں۔"
میں نے فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔
"یہاں؟ ہمارے دفتر میں؟ ناممکن!"
چیف ایڈیٹر کرسی سے اٹھ کر بولا۔

"یقین نہ آئے تو باہر ریسپشن لاج میں جاکر دیکھ لو" میں نے کامل بھروسے سے کہا۔

"او مائی گاڈ!"

شیطان ٹائمز کا ایڈیٹر گلا پھاڑ کر بولا۔

"یہ دنیا کی سب سے بڑی، سب سے دھانسو خبر ہے:

Greatest scoop on earth

میں تمہیں آج سے پانچسو روپے کی ترقی دیتا ہوں، تمہیں اپنا اسسٹنٹ ایڈیٹر نہیں، نیوز ایڈیٹر نہیں، جائنٹ، چیف ایڈیٹر مقرر کرتا ہوں۔

میری غیر حاضری میں تم میری کرسی پر بھی بیٹھ سکتے ہو۔ ایڈیٹوریل لکھ سکتے ہو۔"

شیطان ٹائمز کے ایڈیٹر نے فرطِ مسرت سے مجھے گلے لگا لیا اور میرا منہ چومتے ہوئے بولا:

"چلو چلو! مجھے ملکہ دکھاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ میرا انتظار کیے بغیر باہر ریسپشن روم کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

میں بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا چلا گیا۔

ریسپشن روم کے اندر جا کر وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور چاروں طرف غور سے دیکھنے لگا لیکن اسے کہیں پہ ملکہ نظر نہ آئی۔

اسے ایک کسان عورت نظر آئی جو اپنے پھٹے لہنگے سے جوئیں چن رہی تھی اور جس کے قریب اس کے تین بچے ننگ دھڑنگ بیٹھے تھے۔

"کہاں ہے ملکہ؟"

اس نے چلّا کر مجھ سے پوچھا۔

میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ ملکہ ہے؟"

وہ غصے سے چلا کر بولا۔

"بالکل وہی ہے، اس کا نام ملکہ ہے اور پالم میں رہتی ہے اور وہیں تم نے مجھے ملکہ سے ملنے کے لیے بھیجا تھا۔"

"ابے احمق!"

ایڈیٹر نے اپنا سر پیٹ کر کہا۔

"میں نے تمہیں اس جوئیں چننے والی ملکہ سے نہیں اس باہر والی ملکہ کے استقبال کے لیے بھیجا تھا جو انگلینڈ سے آ رہی ہے . . . !"

"تو تم نے مجھے پہلے بتا دیا ہوتا۔"

میں نے آزردہ ہو کر کہا۔

"اب مجھے کیا معلوم تھا؟"

"ابے گدھے!"

ایڈیٹر میرا گلا پکڑتے ہوئے بولا۔

"کیا تجھے اتنی تمیز نہیں ہے کہ دلی والے اس کھیتوں والی ملکہ کا سواگت کریں گے جس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں، جس کے بچوں کے تن پر ایک لنگوٹی ہے اور پاؤں ننگے اور زخمی ہیں، پیٹ بھوکا ہے اور سر ننگا ہے۔

کیا اس گنوار اور بے وقوف کسان عورت کے سواگت کے لیے جنتا کا دو کروڑ روپیہ برباد کیا جا رہا ہے؟"

"یہ گنوار اور بے وقوف عورت نہیں ہے۔"

میں نے شیطان ٹائمز کے ایڈیٹر کو پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اب مجھے بھی غصہ آرہا تھا۔

یہ بڑی بہادر، سورما اور شیرنی ہے۔

اس اکیلی عورت نے دشمنوں کے خلاف لڑکر اپنے بچوں اور اپنے خاوند کے کھیتوں کو بچایا ہے...... اس کی شکل وصورت دیکھو کسی طرح سے بھی یہ تمہاری ملکہ سے کم نہیں ہے...... تمہاری ملکہ اگر دن میں آٹھ گھنٹے کام کرتی ہے تو یہ دن میں بارہ گھنٹے کام کرتی ہے، تمہاری ملکہ اگر اپنی سلطنت چلاتی ہے تو یہ بھی اپنے کھیت سنبھالتی ہے اور کسی وزیر کی مدد کے بغیر سنبھالتی ہے اگر تمہاری ملکہ اپنے بچوں سے محبت کرتی ہے تو یہ تو اپنے بچوں پر جان

چھڑکتی ہے۔

پھر اس کے کپڑے پھٹے ہوئے کیوں ہیں؟ اس کے بچے بھوکے کیوں ہیں؟ اور تم لوگ اس کے کھیتوں کا اناج کھا کر اس کا نمک کیوں حرام کرتے ہو؟ دوزانو ہو جاؤ مسٹر اور اپنی ملکہ کو سلام کرو۔"

چیف ایڈیٹر دانت پیسنے لگا، اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔

وہ چیخ کر بولا۔

"گیٹ آؤٹ!"

(۵)

ملکہ اسی رات اپنے تینوں بچوں کو لے کر واپس پالم چلی گئی۔

"کبھی کبھی میں اس کے کھیتوں میں جاتا ہوں اور اس سے پوچھتا ہوں" ملکہ ہمارے شہر میں کب آؤ گی؟"

وہ میرا سوال سن کر مسکرا دیتی ہے، اس کی نگاہیں زمین سے اٹھ کر آسمان پر چلی جاتی ہیں اور وہ خوابیدہ نظروں سے دور افق کے پار دیکھتے ہوئے کہتی ہے:

"میں آؤں گی، جب تمہارے شہر والے مجھے پہچان جائیں گے!"

چاندنی چوک میں

بے موسم کی

ہولی

گنداداں

"کیوں جی! آپ کے گھر میں کوئی گندی کتاب ہے؟"

ڈیوڑھی میں سے آواز آئی، تو سروج چولھے پر سے روٹیاں اتارتے اتارتے جلدی سے ڈیوڑھی میں چلی آئی اور میرے ساتھ ایک دبلے پتلے کھدر دھاری بھگت جی کو دیکھ کر جھینپ گئی۔

ہم بھی اسے دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے جھینپ گئے۔ کیوں کہ سروج اس وقت بالکل عجیب حالت میں تھی۔

دوپٹہ سر پر نہ تھا، بال بکھرے ہوئے تھے، سینہ ابھرا ہوا تھا۔ وہ ایک پھٹی ہوئی قمیض پہنے ہوئے تھی۔ جس میں سے اس کا خوبصورت جسم جگہ جگہ سے جھانک رہا تھا۔

پہلی نظر میں ہمیں وہ بالکل کسی ہندوستانی فلم کا اشتہار معلوم ہوئی۔

کھدر دھاری بھگت جی نے ہات جوڑ کر نمسکار کرتے ہوئے بڑے نرم لہجے سے کہا۔

"بہن جی! آپ کے گھر میں اگر کوئی گندی کتاب ہو تو ہمیں دان دے دیجئے۔"

سروج نے میری طرف گھور کر دیکھا۔

میں نے نڈر ہو کر کہا۔

"بھگت جی! اگر بہن سروج کے گھر میں گندی کتابیں نہ ملیں گی تو کہاں ملیں گی؟

"اس کا گھر والا گندی کتابیں چھاپنے کا ہی دھندا کرتا ہے۔"

"چھی چھی بہت بری بات ہے!"

بھگت جی سروج کی طرف افسوس سے دیکھ کر بولے۔

سروج نے چمک کر کہا۔

"گندی کتابیں نہ چھاپیں تو کیا کریں؟"

کوئی اور کام جب نہ ملے تو کیا بھوکے مر جائیں؟

اسی سے پوچھو۔۔۔۔۔! سروج نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے گھر والے نے کام کے لیے کہاں کہاں کوشش نہیں کی"

میونسپلٹی میں، سیکریٹریٹ میں، فرموں میں، ٹھیکیداروں کے یہاں، گاؤں پر، کہاں کہاں ٹکریں نہیں ماریں؟ جب کام نہ ملے تو کیا اپنے تینوں بچوں کو بھوکا ماردیں؟"

میں نے کہا۔

"انہیں فلمی پوسٹر کھلایا کرو، اس میں ہر طرح کے وٹامن ہوتے ہیں۔"

"آنسے دو ان کو۔"

سروج میرے سامنے ہوا میں مکّا گھماتے ہوئے بولی۔

"معلوم ہوتا ہے تم نے اب کوکین کا دھندا چھوڑ کر سرکار کی مخبری شروع کردی ہے۔"

"تم ہمیں غلط سمجھ رہی ہو بہن۔"

بھگت جی نے بے حد نرمی سے کہا۔

"ہم سرکاری آدمی نہیں ہیں، ہم تو سروے کے کارکن ہیں، آپ کے سیلوک ہیں۔"

"جی ہاں۔"

میں نے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے ہم گندی اور بنجر زمینیں جمع کرتے تھے، آجکل گندی اور عریاں کتابیں جمع کرتے ہیں۔

اگر آپ اپنے گھر سے کچھ گندی کتابیں وان میں دیں گی تو ہم انہیں لے کر فوراً آجائیں گے۔"

سروج نے گھور کر میری طرف دیکھا اور اس طرح غصہ سے دیکھا جس طرح فلم 'ایک دو تین' میں مینا شوری موتی لال کی طرف دیکھتی ہے۔

پھر وہ پلٹ کر جلدی سے اندر چلی گئی اور الٹے پاؤں واپس لوٹ کر کچھ کتابیں ہمارے سامنے ٹپک کر غصے سے پھنکارتی ہوئی واپس چلی گئی۔

میں کتابیں اٹھا کر انہیں باری باری دیکھنے لگا۔

"اصلی کوک شاستر باتصویر"

واہ واہ!

"اسے تو میں ضرور پڑھوں گا۔"

بھگت جی نے جلدی سے وہ کتاب مجھ سے چھین لی۔

میں دوسری کتاب دیکھنے لگا۔

"کام سوتر، لیکھک واتسیاین۔"

اچھا میرا خیال اب تک یہی تھا۔ کہ واتسیاین جی صرف پریوگ وادی کویتا کرتے ہوں گے۔

یہ حضرت تو بڑے چھپے ہوئے رستم نکلے۔"

بھگت جی نے ڈانٹ کر مجھ سے کہا۔

"احمق ہوئے ہو وہ واتسیاین اور تھے۔ یہ واتسیاین اور ہیں۔"

"یہ کام سوتر تو ہزار برس پرانی کتاب ہے۔"

"تو کیا یہ کتاب بھی گندی ہے۔"

"گندی کتاب تو گندی کتاب ہے، چاہے وہ کسی زمانے میں لکھی جائے۔"

"مگر میں نے سنا ہے بھگت جی! کہ کام سوتر تو سیکس کے بارے میں لکھی گئی ہے اور یہ ایک گیان کی کتاب ہے۔ وگیان کی پستک ہے یعنی جہاں تک اس زمانے کی سائنس سیکس کے بارے میں سوچ سکتی تھی۔"

"مگر ہے تو سیکس کے بارے میں، اس لیے گندی ہے۔"

بھگت جی نے وہ کتاب بھی مجھ سے چھین لی۔

تیسری کتاب پر ایک نیم عریاں عورت کی رنگین تصویر بنی تھی جو ایک باتھ ٹب میں نہا رہی تھی۔ کتاب کا نام تھا۔

"غسل خانے کی محبوبہ"

"چھی چھی!"

میں نے جلدی سے کتاب کو بھگت جی کے حوالے کر دیا۔

بھگت جی کتاب کی تصویر دیکھ کر بولے۔

"ایسی تصویریں دیکھ کر ہی تو ہمارے دیس کے نوجوانوں کا کیریکٹر خراب ہوتا ہے۔"

"چلئے یہاں سے چلیں"۔
میں نے بھگت جی سے کہا۔
مگر بھگت جی تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔
"دیکھئے تو کتنی گندی ہے ...... کتنی گندی تصویر آرٹسٹ نے
بنائی ہے۔ عورت کے بال کھلے ہیں"۔
"شاید سر دھونے جا رہی ہو"۔
"اجی نہیں، بال ہی کھلے نہیں ہیں، ساری باہیں کھلی ہیں، گلا ننگا ہے"۔
"اجی چھوڑئیے"۔
میں نے کہا۔
"چھاتیاں ننگی ہیں، پیٹ ننگا ہے"۔
بھگت جی تصویر کے ایک ایک حصے کو دھیان سے دیکھتے ہوئے
بولے۔
"بڑی گندی تصویر ہے"۔
"اسے جھولے میں ڈالیے اور آگے چلئے، ابھی تین گھر اور باقی ہیں"۔
میں نے بھگت جی کے ہات سے کتاب لے کر ان کے جھولے
میں ڈال دی اور ان کو ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔
بھگت پھپھوندی رام نے اپنے سچے اور خوبصورت کردار سے مجھے

اتنا متاثر کیا۔ کہ میں اپنا جما جمایا کاروبار چھوڑ کر سرؤدے اندولن میں شامل ہو گیا۔
پہلے ہم لوگ بھومی دان کا کام کرتے تھے۔ اس میں جنتا نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا۔ کچھ ہی سال میں ہمیں لاکھوں ایکڑ زمین دان میں مل گئی۔ مگر بعد میں جب جانچ پڑتال کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس میں سے زیادہ تر زمین بنجر اور بے کار تھی۔

دان دینے والوں کی اخلاقی گراوٹ پر ہمیں بہت دکھ ہوا۔ اس سے ہمارے من میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دیش اس وقت تک ترقی کے راستے پر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جب تک یہاں کے لوگوں کے شعور کی اخلاقی سطح اونچی نہ کی جائے۔

اس کے لیے ایک طرف سرکار نے نشہ بندی شروع کردی۔ دوسری طرف ہم نے فلمی پوسٹر پھاڑنے شروع کر دیئے۔

اور اب ہم لوگ گلی گلی محلے محلے جا کر گندی کتابیں جمع کر رہے تھے۔

آج میں بھگت پھپھوندی رام کو اپنے محلے میں لے آیا تھا۔

دوسرا گھر جہاں میں بھگت پھپھوندی رام کو لے گیا وہ لالہ ٹھاکر داس کا تھا۔

لالہ ٹھاکر داس چاندنی چوک کے مشہور جوہری تھے۔ ایک زمانہ میں دلی کی ساری مشہور طوائفیں ان کے یہاں سے اپنا زیور خریدتی تھیں۔

مگر جب سے دلی میں طوائفیت بند ہوئی تھی۔ لالہ ٹھاکرداس کا کاروبار کچھ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

آجکل وہ اپنی دکان پر زیورات کے علاوہ ولایتی ناولٹی کا سامان بھی بیچتے تھے اور طوائفوں کا وہی زیور سستے داموں پر خرید رہے تھے جسے انہوں نے کبھی مہنگے داموں بیچا تھا۔

لالہ ٹھاکرداس کرشن بھگت تھے۔ دن میں دو بار مندر جاتے تھے اور اپنی تینوں عورتوں کے گھر ہر سال میں تین بار کتھا کھلواتے تھے۔

انہوں نے ہمارے اندولن کو چلانے کے لیے دل کھول کر چندہ دیا تھا اس وقت ہم ان کے گھر ان کا شکریہ ادا کرنے گئے تھے۔

مگر میں داد دیتا ہوں بھگت جی کی اور ان کے اونچے اخلاقی طور کی کہ بھگت پھپھوندی رام اپنے بھگت کے گھر جا کر بھی اپنے فرض سے نہیں چوکے۔

انہوں نے چلتے وقت دیوار پر ٹنگے ہوئے ایک بڑے کیلنڈر پر انگلی رکھتے ہوئے لالہ ٹھاکرداس سے کہا۔

"یہ کیا ہے؟"

"کیلنڈر ہے۔"

"مگر کس کا کیلنڈر ہے؟"

"رادھا کرشن کا کیلنڈر ہے۔"

لالہ ٹھاکر داس نے جواب دیا۔

"کیا رادھا اسی طرح ادھ ننگی رہتی تھیں؟"

بھگت پھپھوندی رام نے غصے سے پوچھا۔

"پتلے کپڑے کے اندر سے انگ انگ جھانک رہا ہے۔"

"ممکن ہے اس زمانے میں نائی لون ایجاد ہو چکا ہو۔"

میں نے کہا۔

"تم چپ رہو۔"

بھگت جی غصے سے بولے۔

"اور آرٹسٹ نے کرشن کو کیسے پیش کیا ہے۔

دیکھئے تو اس کرشن کی نگاہ میں کیسی بے حیائی اور آوارگی ہے۔ یہ رادھا

کو کیسی بری نگاہوں سے تک رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ممکن ہے جسے آپ بے حیائی اور آوارگی سمجھ بیٹھے ہوں وہ صرف

محبت ہو۔"

"نہیں، یہ گندا کیلنڈر ہے۔"

بھگت جی نے دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر کھینچ کر اپنے جھولے میں ڈالتے

ہوئے کہا۔

"مجھے حیرت ہے لالہ ٹھاکر داس جی!"

لالہ ٹھاکر داس تھر تھر کانپنے لگے۔ گھگھیاتے ہوئے بولے۔

"بھگت پھپھوندی رام جی! مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے بھول ہوئی"۔

اصل میں میں نے اس کیلنڈر کو کبھی غور سے دیکھا ہی نہیں۔ میں اسے ہمیشہ رادھا کرشن کا ایک خوبصورت کیلنڈر سمجھتا رہا۔

"معاف کر دیجئے بھگت جی!"

میں نے سفارش کرتے ہوتے کہا۔

"اس بے چارے کے دماغ کو شاید پھپھوندی لگ گئی تھی۔

بھگت جی نے مجھے غصے سے گھورا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

باہر گلی میں جا کر پوچھنے لگے۔

"اب کہاں چلنا ہوگا؟"

میں نے کہا۔

"اب تو ایک ہی گھر باقی رہ گیا ہے جہاں سے ہمیں کچھ مل سکتا ہے"۔

"کون سا گھر ہے وہ؟"

"وہ اس محلے کا سب سے غریب گھر ہے وہاں ایک بڑھیا اپنے بیٹے کے ساتھ رہتی ہے۔

"بیٹا سینما کے اشتہار دیواروں پہ چپکانے کا کام کرتا ہے۔"
"تو اس کے گھر ضرور چلنا چاہیئے۔"
بھگت جی خوش ہو کر بولے۔
"اس کا نام گوتم ہے مگر وہ ایک . . . سرپھرا اور باغی ہے۔"
میرے خیال میں تو ہمیں اس کے گھر نہیں جانا چاہیئے۔"
"واہ جہاں سب سے زیادہ گندے پوسٹر نکلنے کی امید ہے وہاں نہ جائیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"
بھگت جی بولے اور میں سر جھکا کر ان کے ساتھ ہو لیا۔
راستے میں ایک پبلک نل کے نیچے ایک نوجوان عورت نہاتی ہوئی مل گئی۔
اس کی پھٹی دھوتی اس کے گورے جسم سے بالکل چپک گئی تھی اور وہ بے چاری ہمیں دیکھ کر ہی شرما گئی۔ اس نے جلدی سے اپنا منہ موڑ لیا۔ ایسا کرنے سے ہمیں اس کے جسم کی دوسری دلکش گولائیاں بھی نظر آ گئیں جو اب تک نظر سے اوجھل تھیں۔
میں نے کہا۔
"بالکل غسل خانے کی محبوبہ کا پوز ہے۔"
بھگت جی بولے۔

"آخر یہ عورت گھر پر کیوں نہیں نہاتی ؟"
میں نے کہا۔
"اس لیے کہ ہمارے گھروں میں اکثر غسل خانے نہیں ہوتے کہیں کہیں تو نلکا بھی نہیں ہے، اس حالت میں لوگ کیا کریں ؟"
"چلو چلو، آگے چلو۔"
"میرے خیال میں اس ننگی عورت کو ضرور سمجھانا چاہیئے۔ آخر یہ کیوں پبلک نل کے نیچے نہا رہی ہے ؟"
"چلو چلو، آگے چلو۔"
بھگت جی جلدی سے آگے بڑھ گئے۔
جب گوتم کے گھر جاکر بھگت جی نے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو گوتم بھڑک اٹھا۔
"میں گندے فلمی پوسٹر بناتا نہیں صرف انہیں دیوار پر چپکاتا ہوں۔" بھگت جی بولے۔
"برے کام میں مدد دینا بھی برا ہے، اس سے سماج میں گندگی پھیلتی ہے۔"
"سماج میں اور جن باتوں سے گندگی پھیلتی ہے انہیں دور کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے ؟"
گوتم غصے ہو کر بولا۔

"سماج میں جن گندے اصولوں سے بھوک، بیکاری، غریبی بڑھتی ہے۔
وہ تمہاری نظروں میں کیوں نہیں آتے ؟
صرف فلمی پوسٹر پھاڑنے سے کیا ہوگا ؟
بداخلاقی، بدمعاشی، بلیک مارکیٹ کا اتنا بڑا گندہ پوسٹر جو سماج کے منہ
پر چپکا ہُوا ہے، اسے پھاڑنے کی ہمت کیوں نہیں کرتے بھگت جی!
ہولی کھیلو تو ایسی، جس میں اس دیش کی رشوت خوری، کنبہ پروری، جات
پات کی لعنت، چوری چکاری اور منافع خوری، ساری کی ساری جل کر راکھ ہوجائیں۔
ایسا کرسکو بھگت جی، تو میرے گھر سے سارے فلمی پوسٹر اٹھا لے جاؤ بلکہ
میری جان کی بھی ہولی کھیلو، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"
"ہیئر، ہیئر"!
میں نے خوش ہوکر کہا۔
"بھگت جی! لڑکا ٹھیک کہتا ہے۔ اسے آندولن میں شامل کرلو۔"
"جی نہیں۔"
"بالکل احمق اور سرپھرا ہے۔"
بھگت جی غصے ہوکر بولے۔
"چلو یہاں سے چلیں۔"
چاندنی چوک میں ہم لوگوں نے بڑی شان سے گندی کتابوں، گندے

کیلنڈروں اور گندے فلمی پوسٹروں کو جلا کر نئی ہولی منائی۔
راہ چلتے سینکڑوں لوگ اکٹھے ہو گئے۔
بھگت جی نے موقعہ دیکھ کر اپنا اپدیش شروع کر دیا۔
جب بھگت جی اپنا اپدیش دے رہے تھے اس وقت میں جلدی جلدی سے کیلنڈروں، فلمی پوسٹروں اور کتابوں میں سے غسل خانے کی محبوبہ تلاش کرنے لگا۔
مگر اور سب کتابیں تو مجھے وہاں مل گئیں بس وہی ایک کتاب مجھے نہیں ملی۔
ہار کر میں نے سارے ڈھیر پہ مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔
کتابیں جل رہی تھیں، بھگت جی اپدیش دے رہے تھے اور میں ان کے کھدر کے سفید جھولے کو دیکھ رہا تھا جس کے اندر مجھے ایک کتاب ہلتی ہوئی نظر آ رہی تھی ٭

———٭———

۲۰۰

برس پرانا

قرض

چکایا

پرانا قرضہ

آج سے دو سو سال پہلے انگریزی فوجوں نے امریکہ کی آزادی کی لڑائی کے دنوں میں فلے ڈیلفیا کے ایک گرجا گھر کی عمارت کو نقصان پہنچایا تھا۔

اس سلسلے میں کچھ مہینے ہوتے اسی گرجا گھر کے پادری جوزف کوسی نے انگلینڈ سے ہرجانے کی رقم طلب کر لی۔

دو سو سال کے بعد! انگلینڈ کے چانسلر آف اکیس چیکر نے اس گرجے کے پادری کو ایک بہت اچھا خط لکھا اور ہرجانے کے طور پر چھ پونڈ آٹھ شلنگ اور ایک پنس کی رقم ادا کی۔

یہ خط دنیا کے تمام اخباروں میں چھپ چکا ہے اور دنیا کے چاروں کونوں میں انگریزوں کی سچائی اور فیصلہ کی دھوم مچ گئی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں جب کہ بھائی بھائی کا قرضہ ادا نہیں کرتا۔

آج بھی ایک قوم ایسی ہے جو اپنا قرضہ پائی پائی کر کے چکا دیتی ہے۔
اور وہ ہے انگریز قوم۔
دو سو سال پرانا قرضہ چکا کر انگریزی چانسلر نے انگریزی شرافت کی ایسی مثال قائم کی ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔
ہندوستان میں انگریز چانسلر آف ایکسچیکر کے خط کا بہت کافی اثر ہوا ہے۔
اور سب سے زیادہ اثر مجھ پر ہوا ہے۔
جب میں نے اخباروں میں یہ خط پڑھا تو میں انگریزی حکومت کی انسانی محبت اور شریف عادات کا قائل ہو گیا۔
میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں دو گھنٹے تک روتا رہا۔
پھر میں آنسو پونچھ کر اپنی گندی کھولی سے باہر نکلا اور اخبار سے یہ خبر کاٹ کر کچھ لوگوں سے ملنے چلا گیا۔
ان ملاقاتوں کا نتیجہ اب تک یہ نکلا ہے کہ صرف ہمارے ملک ہندوستان سے سینکڑوں لوگوں نے انگریزی وزیر کو مبارک باد کے خط لکھے ہیں۔
یہ خط دنیا کے کسی اخبار میں نہیں چھپے ہیں۔
یہ خط پہلی بار آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے سارے خط تو نہیں چھاپے جا سکتے۔ نمونہ کے طور پر صرف کچھ خط پبلش کر رہا ہوں۔

پہلا خط

پانڈے شبھ وجن شرما کی طرف سے، چانسلر آف ایکسچیکر کے نام!

جے رام جی کی!

آج سے دو سو سال پہلے انگریزوں نے فلے ڈیلفیا کے ایک گرجا گھر کی عمارت کو نقصان پہنچایا تھا، اس کے لیے آپ نے چھ پونڈ آٹھ شلنگ ایک پنس کا ہرجانہ ادا کرنے کا جو قدم اٹھایا ہے، اس کے لیے میں آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے اسی طرح انگریزی فوجوں نے لڑائی لڑتے ہوئے میرے پرکھوں کے دو مندروں کو نقصان پہنچایا تھا۔

انگریزی فوجوں کی گولہ باری سے ہمارا ایک مندر تو بالکل ٹوٹ گیا تھا، اور دوسرے کی چار دیواری گر گئی تھی۔

اس زمانے کے تحصیلدار نے نقصان کا اندازہ دو لاکھ روپے لگایا تھا۔

مہربانی کر کے یہ رقم جلد سے جلد بھیجنے کی تکلیف کیجئے۔

نقصان کا تخمینہ تحصیلدار بنارس کے تحریری ثبوت کے ساتھ آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔

دوسرا خط

مولانا صلاح الدین کی طرف سے، لارڈ بشپ آف کینٹربیری کے نام۔

السلام علیکم!

آپ کو معلوم ہو گا کہ شری رنگ پٹم کے مقام پر ٹیپو سلطان کے خلاف لڑتے ہوئے انگریزی فوجوں نے تین مسجدوں کو شہید کر دیا تھا۔

علاوہ جانی اور روحانی نقصان کے صرف مالی نقصان کا اندازہ دس لاکھ روپے کا ہے جو انگریزی تاریخ نگاروں کے تاریخی ریکارڈ سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ جس کی ایک نقل میں اس خط کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔

مجھے پورا بھروسہ ہے کہ فلاڈیلفیا کے گرجا گھر کی مثال کو سامنے رکھ کر ہمیں بھی دس لاکھ کا ہرجانہ ضرور ادا کر دیا جائے گا۔

مسجد اور گرجا گھر دونوں خدا کے گھر ہوتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا گرجا گھر کے ہرجانے کو نظر میں رکھتے ہوئے اس خاکسار کو مسجد کا ہرجانہ دلوایا جائے۔

یہ بات میرے لیے اور حامیانِ اسلام کے لیے بصد تشکر و امتنان کا باعث ہو گی۔

مخلص

الحاج مولانا صلاح الدین

چشتی

امام مسجد، شری رنگ پٹم

"تیسرا خط"

ماسٹر تارا سنگھ کی طرف سے، لارڈ ہوم کے نام

ست سری اکال!

آپ جانتے ہیں اور ساری دنیا جانتی ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پنجاب کے واروں پہ انگریزوں نے فوجی دباؤ ڈال کر ان سے کوہ نور ہیرا چھین لیا تھا۔

اس دھاندلی کے خلاف اس وقت بھی آواز اٹھائی گئی تھی اور انگریزی حکومت کے دوران میں بھی ہندوستانیوں کی طرف سے بار بار احتجاج کیا گیا تھا۔

اب جب کہ انگریزی حکومت پرانے قرضے چکا رہی ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کوہ نور ہمیں واپس دے دیا جائے۔

جوہریوں کے اندازے کے حساب سے کوہ نور کی قیمت آٹھ کروڑ روپے ہوتی ہے۔ ہم کو کوہ نور فوراً مل جانا چاہیئے۔

"چوتھا خط"

بیگم رفعت محل آف لکھنؤ کی طرف سے، انگریزی چانسلر کے نام

آداب عرض!

بیگمات اودھ کے قصہ سے تو آپ واقف ہوں گے۔

جب کمپنی بہادر کو اپنی فوجوں کو تنخواہ بانٹنے کے سلسلہ میں روپیہ کی سخت ضرورت پڑی تو اس سلسلہ میں روپیہ کی سخت ضرورت پڑی تو اس وقت کے جناب لاٹ صاحب بہادر وارن ہیسٹنگز مرحوم نے (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) بیگماتِ اودھ کا سارا خزانہ ضبط کر لیا تھا جو پچھتر کروڑ روپے کی مالیت کا تھا۔

ازراہِ کرم وہ رقم جلد سے جلد ارسال فرمائیے۔

ان دنوں لکھنؤ میں سیلاب بھی آرہا ہے۔

اس لیے بندی اگر رقم جلد وصول پائے گی تو آپ کے جان و مال کو دعا دے گی۔

امید ہے کہ آپ اس ذراسی رقم کے لیے مجھے یاد دہانی کا موقع نہ دیں گے۔

"پانچواں خط"

میئر آف کلکتہ کی طرف سے، میئر آف لندن کے نام

یہ میں کیا سنتا ہوں؟

انگریزی چانسلر نے آج سے دو سو سال پہلے ایک امریکی گرجا گھر کا جنگلہ ٹوٹ جانے پر چھ پونڈ آٹھ شلنگ ایک پنس کی بہت بڑی رقم ادا کی ہے۔ کیا رقم ادا کرتے وقت وہ بلیک ہول آف کلکتہ کا واقعہ بھول گئے۔

جو لارڈ کلائیو کی بدمعاشی اور بری عادت کی وجہ سے ہوئی تھی۔
اور جس میں درجنوں بنگالیوں کی جانیں چلی گئی تھیں۔
یقیناً ایک انسان کی زندگی گرجا گھر کی ایک دیوار سے زیادہ قیمتی ہے۔
مہربانی کر کے ان جانوں کا ہرجانہ ان کے وارثوں کو ادا کر کے بنگالی قوم کو شکریہ کا موقع دیجئے۔
مرنے والوں کے وارثوں کی تعداد آج دو لاکھ سے اوپر ہے۔
ہر آدمی کو ایک سو روپیہ ادا کرنے پر یہ ہرجانہ دو کروڑ پچاس لاکھ اٹھتر ہزار نو سو سات روپے سات آنے تین نئے پیسے ہوگا۔
اگر آپ نے یہ روپیہ ادا نہ کیا تو ہم آپ کے چھ پونڈ آٹھ شلنگ ایک پنس والے چیک کو محض ایک سٹنٹ سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔

"چھٹا خط"

ہندوستان کے وزیر اعظم کی طرف سے انگریزی وزیر اعظم کے نام
یور ایکسی لینسی!
یہ کہنا مشکل ہے کہ برطانوی چانسلر نے دو سو برس پہلے کے گرجا گھر کے نقصان کا ہرجانہ ادا کر کے صحیح قدم اٹھایا ہے یا غلط۔
میں مذہبی آدمی نہیں ہوں لیکن اس قصہ کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ایک ہرجانہ ادا کیا جا سکتا ہے تو دوسرا کیوں نہیں کیا جا سکتا۔

مگر اس بات کا بھی آسانی سے فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

کیونکہ دنیا بہت پیچیدہ ہے اور اس میں اتنی طاقتیں اتنے رجحانات اتنے جذبات کام کرتے ہیں کہ کسی ایک نتیجہ پر پہنچنا بہت مشکل ہے۔ بہرحال اس دنیا میں زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ ملانی ہی پڑتی ہے۔ چاہے وہ ایٹم بم ہو یا . . . .

اب یہ ایک تاریخی سچائی کہ انگریزی حکومت کے زمانہ میں جب ہندوستانی قوم غلام اور پس ماندہ تھی۔ سارے ملک میں اٹھارہ بڑے بڑے قحط پڑے تھے (میں کامن ویلتھ کے رشتے کو خیال میں رکھتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قحطوں کا ذکر نہیں کروں گا) جن میں جان و مال کے نقصان کی سیدھی ذمہ داری انگریزی حکومت کی تھی اور ہے۔

ان قحطوں میں اڑلیسہ کی ایک تہائی آبادی اور بہار کی ایک چوتھائی آبادی ختم ہو گئی۔

پچھلی جنگ عظیم کے دنوں میں بنگال کے قحط میں پینتیس لاکھ بنگالی موت کا شکار ہو گئے۔

بھارت سرکار نے اس جان و مال کے نقصان کا اندازہ پچیس ملین کھرب پونڈ لگایا ہے۔

بس بھارت سرکار اور برٹش سرکار کی گہری دوستی اور بین الاقوامی بہبودی

کو مدنظر رکھتے ہوئے اُمید کرتا ہوں کہ آپ جلد سے جلد حکم دیں گے کہ پچپیس ملین کھرب پونڈ کی رقم چیک کے ذریعہ ہندوستانی خزانے کو بھیج دیں گے۔

سنا ہے کہ ان خطوں کے بعد برٹش وزیروں کی ایک خاص بیٹھک بلائی گئی۔ کارروائی کے دوران میں معلوم ہوا کہ نہ صرف بھارت سے بلکہ لنکا سے، پاکستان سے ملایا سے، برما سے، سنگاپور سے، بورنیو سے، چین سے، مصر سے، عراق سے، افریقہ سے، ویسٹ انڈیز سے اور دوسری ان تمام جگہوں سے جہاں برطانیہ کی حکومت رہ چکی ہے، ہزاروں خط اس سلسلے میں ملے ہیں ان میں سے ہر خط اسی قسم کے قرضے کے بارے میں ہے۔ مگر جب ان رقموں کو جوڑا گیا تو معلوم ہوا کہ اگر ہر جانہ کی کل رقم ادا کر دی جائے گی تو مالی اعتبار سے انگلینڈ بالکل اسی جگہ پہنچ جائے گا جہاں وہ آج سے ٹھیک دو سو سال پہلے تھا۔

وزیر اعظم
کا ایک
پرانا میزبان

پھٹا لحاف

آنند بھون میں ایک لمبا کمرہ " ایل" کی شکل کا ہے۔

کمرے میں اس قدر گہرے اور دبیز غالیچے ہیں کہ قدموں کی چاپ سنائی نہیں دیتی اور پنڈت نہرو کی میز وہاں بچھی ہے۔

ایک کونے میں کہ جب تک آدمی میز کے بالکل قریب نہ آجائے وہ پنڈت جی کو نہیں دیکھ سکتا۔

بڑی میز کے قریب بائیں طرف ایک بڑی فرینچ کھڑکی ہے۔

لمبی اور مخروطی اور تراشی ہوئی، انسان کی انگلی کی طرح آسمان کی طرف کھلتی ہوئی۔

پنڈت جی میز سے سر اٹھا کر کبھی کبھی باہر آسمان کی طرف اس طرح دیکھ لیتے ہیں جیسے وہ اس انگلی سے ستاروں کو چھو لینا چاہتے ہوں۔

شام کا وقت ہے۔

کمرے میں اندھیرا بڑھ چلا ہے۔

کچھ اس لیے بھی کہ گہرے گہرے رنگوں والے دبیز پردے روشنی کو اندر نہیں آنے دیتے جو ابھی تک باہر افق پہ کھلی ہوئی ہے۔

میز پہ ایک ٹیبل لیمپ پڑا ہے۔

پردہ اٹھنے کے چند سیکنڈ بعد پنڈت جی آہستہ سے ٹیبل لیمپ کا سوئچ دباتے ہیں۔

سوئچ دباتے ہی ان کا سوچ میں ڈوبا ہوا چہرہ روشن ہو جاتا ہے اور ان کی کرسی کے پیچھے ہندوستان کا بڑا نقشہ صاف اور واضح صورت میں نظر آنے لگتا ہے۔

ایک سیکرٹری آتا ہے۔ دیکھتے ہی بھونچکا رہ جاتا ہے۔

پنڈت جی کہتے ہیں۔

پنڈت نہرو:۔

دیکھتے کیا ہو؟

کاغذات پیش کرو۔

سیکرٹری نمبر ا:

لاؤس کمیشن کو پھر سے چکانے کے متعلق یو این او کے سیکرٹری جنرل

کو جو تار بھیجا جائے گا اس کا مسودہ تیار ہے۔

دیکھ لیجئے۔

مگر آپ کہاں چلے گئے تھے؟

پنڈت نہرو:

کہیں نہیں۔ یہیں تھا (مسودہ دیکھتے ہوئے) مگر یہ — یہ — یہ کیا ہے؟

یہ تو لومبا کے بارے میں میرا مسودہ ہے۔ کیا — کیا — کیا تم — یہ نہیں جانتے کہ لاؤس اور لومبا میں کیا فرق ہے؟ (زور سے کاغذات پھینک دیتے ہیں۔)

سیکریٹری نمبر ۱:

ساری سر!

ٹائپسٹ سے غلطی ہو گئی ہے۔

دوبارہ لاتا ہوں۔

(جلدی سے کاغذ اکٹھا کرتا ہے، اتنے میں دوسرا سیکریٹری آتا ہے۔)

سیکریٹری نمبر ۲:

یوپی کے کانگریسیوں میں جو دھڑے بندی جاری ہے، اس کے سلسلے میں کچھ کانگریسی آپ سے ملنے آئے ہیں۔

پنڈت نہرو:

"کون لوگ ہیں یہ؟"

سیکریٹری ۲:

دو آدمی دھڑہ ۱ کے ہیں، دو آدمی دھڑہ ۲ کے ہیں اور ایک آدمی دھڑہ ۳ کا ہے۔

پنڈت نہرو:

مگر میں ان لوگوں سے شاید صبح مل چکا ہوں۔

سیکریٹری ۲:

مگر پنڈت جی وہ کہتے ہیں کہ صبح سے شام تک یوپی کے پالٹیکس میں بڑی بھاری تبدیلی آچکی ہے۔

پنڈت نہرو:

حیرت ہے صاحب، جو تبدیلی میں سترہ سال کی کوشش سے نہ لا سکا وہ یہ لوگ گیارہ گھنٹوں میں لے آئے۔

حیرت ہے صاحب!

(تیسرا سیکریٹری بھاگا بھاگا آتا ہے)

پنڈت جی جلدی سے لپک کر دائیں طرف کے پردے کو ذرا سا ہٹا کے دیکھتے ہیں اور غصے سے کہتے ہیں۔

پنڈت نہرو:

سب دھڑ ہی دھڑ نظر آتے ہیں سر تو کسی کا نظر نہیں آتا۔

نہیں۔

میں نہیں ملوں گا ان سے!

بہت ہو گیا، بہت ہو گیا!

سیکرٹری ۳:

مگر پنڈت جی ....!

پنڈت نہرو:

دیکھتے نہیں ہو میں اس وقت پلاننگ کمیشن کی چوتھی یوجنا کے بارے میں اپنی رپورٹ تیار کر رہا ہوں۔

کیا یہ جھگڑے والے لوگ مجھے کام نہیں کرنے دیں گے۔

نہیں ملوں گا، نہیں ملوں گا — کسی سے نہیں ملوں گا۔

اس وقت جاؤ۔

پنڈت جی کرسی پر بیٹھے بیٹھے گھوم جاتے ہیں اور پھر ایک کھڑے ہو کر ہندوستان کا نقشہ دیکھنے لگتے ہیں۔

تینوں سیکرٹری سر جھکا کر واپس چلے جاتے ہیں۔

پنڈت جی کے دونوں ہاتھ اپنی کمر کے پیچھے آ کر ایک دوسرے میں

بے چینی سے گتھ جاتے ہیں جیسے ان ہاتھوں میں لڑائی ہو رہی ہو!

ایک آواز آتی ہے!

آواز:

شانتی! شانتی!

پنڈت جی تیزی سے گھوم کر پلٹتے ہیں، کہتے ہیں۔

پنڈت جی:

کون ہے؟

کہہ جو دیا میں کسی سے نہیں ملوں گا۔

میز سے چند قدم دور، روشنی کے — ہالے سے باہر کمرے کے اندھیرے میں ایک آدمی کھڑا ہے۔

اس کی صورت نظر نہیں آتی۔

اس کا لباس صاف طور سے دکھائی نہیں دیتا۔ صرف اس کی بھاری آواز سنائی دیتی ہے۔

آواز:

شانتی! شانتی!

پنڈت جی ایک لمحے کے لیے میز پہ ایک کونے میں اپنے سامنے رکھے ہوئے بھگوان بدھ کے مجسمے کو چھو کر اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

پنڈت جی:

ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا۔ شاید تم مجھ سے بولے ! (سر اٹھا کر) کون ہو تم؟ مجھے شانتی کی تلقین کرنے والے ... ذرا سامنے تو آؤ۔

وہ آدمی اندھیرے سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا میز کے قریب روشنی کے ہالے کے اندر آتا ہے۔ پھر اس کا لباس بھی نظر آنے لگتا ہے۔
اس بڈھے آدمی نے ایک پھٹا ہوا لحاف اوڑھ رکھا ہے۔
جس میں جا بجا روئی کے پھوسڑے باہر نکلے نظر آ رہے ہیں۔
لحاف پھٹا ہونے کے علاوہ تیل اور میل کے چکتوں سے داغدار ہو رہا ہے۔

پنڈت جی اسے نہ پہچان کر کہتے ہیں۔

پنڈت نہرو:

کون ہو تم!

بڈھا:

تمہارا پرانا ساتھی۔

پہچان لو.....!

وہ بڈھا آدمی میز پر جھک کر پنڈت جی کے بالکل قریب آ کر اپنی صورت

دکھاتا ہے۔

پنڈت جی کے چہرے پر چند لمحوں تک شک و شبہات کی لہریں ابھرتی ہیں، پھر یکایک صاف ہو جاتی ہیں ——— اور وہ خوشی سے چلّا کر کہتے ہیں۔

پنڈت نہرو:

ارے بھیا . . . . !

پنڈت جی جلدی آ کر اس بڈھے آدمی سے بغل گیر ہوتے ہیں۔ بڈھا بھی اپنی دونوں بانہیں پنڈت جی کے گلے میں ڈال کر رونے لگتا ہے . . . !

بڈھا!

جواہر! تم نے مجھے پہچان لیا آخر . . . ہاں میں ہوں تمہارا بڑا بھیّا بھگوان دین! پرتاپ گڈھ والا۔ . . . .

آخر تم نے مجھے پہچان ہی لیا . . . . !

بڈھا اپنے آنسو پونچھتا ہے، اپنے پھٹے ہوئے لحاف کے ایک کونے سے۔

پنڈت جی اس کی بغل میں ہات دے کر اسے اپنے پاس ایک کونے میں بچھے ہوئے دیوان پر بٹھاتے ہیں۔

بڈھا اپنی خوشی کے آنسو پھر پونچھتا ہے۔

پنڈت نہرو:

منی کیسی ہے؟

بھگوان دین:

منی کا بیاہ ہو گیا، اب تو بھگوان کی کرپا سے اس کے دو بچے ہیں۔

پنڈت نہرو:

اور وینو؟

بھگوان دین:

وینو بڑا ہو گیا اور کانپور چلا گیا کارکھانے میں نوکر ہے، کبھی کبھی اس کی چٹھی آجاتی ہے . . . !

پنڈت جی:

بھوجائی . . . . ؟

بھگوان دین:

تمہاری بھوجائی مر گئی۔

پنڈت جی: ارے . . . . تم نے مجھے خط نہیں لکھا؟

بھگوان دین:

کیا لکھتا؟ لوگ تو روز ہی مرتے رہتے ہیں۔

وقفہ

پنڈت جی خاموش ہو جاتے ہیں، پھر گفت گو کا لہجہ بدل کر کہتے ہیں۔

پنڈت جی:

اور تمہارا بڑا لڑکا کہاں ہے، وہ تو اب جوان ہو گیا ہو گا؟

بھگوان دین:

وہ تو گاؤں میں ہے اور جوان بھی ہو گیا ہے۔ اور اس کا بیاہ بھی ہو گیا ہے۔

پنڈت نہرو:

گھر میں اور تو ہر طرح سے خیریت ہے؟ سب ٹھیک ہے نا؟
کب سے تمہارے گھر کو نہیں دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ !

بھگوان دین: گھر تو وہی ہے اور گاؤں بھی وہی ہے۔

پنڈت نہرو:

گھر میں اور تو ہر طرح سے خیریت ہے؟ ٹھیک ہے نا؟

بھگوان دین:

تم سے ملنے آیا تھا اور مل کر تمہیں نیوتہ دینے آیا تھا!

پنڈت نہرو:

کیسا نیوتہ؟

بھگوان دین!

کھانے کا نیوتہ! یاد ہے، جب کبھی تم ہمارے پرتاپ گڑھ سے گزرے

تم نے ہمیشہ میرے ہاں کھانا کھایا . . . . !

پنڈت نہرو:

بھول سکتا ہوں ؟

چنے کا ساگ اور مکئی اور باجرے کی روٹی بھوجائی کے ہات کی سینکی ہوئی

کیسے بھول سکتا ہوں ؟

وہ آزادی کی لڑائی میں تمہاری مضبوط رفاقت اور محبت ، دلیری

اور جرأت . . . . !

بھگوان دین :

تو آج تو میرے گھر چلو۔

پنڈت نہرو: آج تو نہیں . . . . !

بھگوان دین :

تو کل !

پنڈت نہرو:

کل بھی نہیں۔

بھگوان دین :

پرسوں !

پنڈت نہرو:

پرسوں بھی نہیں، ابھی تو فرصت نہیں ہے بڑے بھیا، بہت کام ہے . . . . مگر میں کسی دن آؤں گا۔

بھگوان دین :

کس دن آؤ گے ؟

سترہ سال ہو گئے تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے۔ گیارہ سال سے میرے گھر کی مفلسی تمہارا انتظار کرتی ہے۔ میرے کھیتوں کی بھوک تمہارا انتظار کرتی ہے۔ میرے کھیتوں کی بھوک تمہارا انتظار کرتی ہے، جواہر!

پنڈت نہرو :

مجھے شرمندہ مت کرو بڑے بھیا . . . کیا ہم . . . . کیا . . . . . ہم . . . . . ہم تمہارا پھٹا ہوا لحاف نہیں دیکھ سکتے . . . . ارے بھائی اتنی سردی بڑھ چلی ہے اور تم یہی پھٹا ہوا لحاف اوڑھے ہوئے ہو . . . ؟

(زور سے گھنٹی بجاتے ہیں، ایک نوکر نمودار ہوتا ہے)

پنڈت نہرو :

ایک نیا کمبل لے کر آؤ۔

دیکھو، دیکھو . . . . . خوب موٹا اور مضبوط ہو، اور ایک نئی جرسی لے کر آؤ، ان کے لیے . . . . اونی جرسی . . . . ان کے سائز کی ہو، اچھی طرح سے دیکھ لو . . . سائز سمجھ لو . . . . !

شیامو:

جی بہت اچھا۔

پنڈت نہرو:

کھڑکی بند کر دیں بڑے بھیا، باہر سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔

بھگوان دین:

نہیں کھلی رہنے دو، اس میں سے آسمان دکھائی دیتا ہے اور تارے

بھی۔۔۔۔!

پنڈت نہرو:

(ہنس کر) ہاں مجھے یاد ہے، جیل میں بھی تم ہمیشہ کمرے کے بجائے

کھلے لان میں سونا پسند کرتے تھے، آسمان کے نیچے تاروں بھری چھاؤں

میں۔۔۔۔۔!

بھگوان دین:

میں ایک کسان ہوں نا!

پنڈت نہرو:

مگر جب تو تمہاری حالت اچھی تھی، جب تو ہم تمہارے گھر بھی گئے تھے،

پھر کیا ہُوا؟

بھگوان دین:

پھر آزادی مل گئی!

پنڈت نہرو:

تو آزادی کیا نہ ملتی؟ آزادی سے کیا نقصان ہوا، آزادی ملتے ہی ہم نے زمینداری ختم کر دی جو انگریزوں کے زمانے میں کبھی ختم نہ ہوئی۔

بھگوان دین:

زمینداری ختم ہوئی تو بھومی داری آگئی، زمین پہ ملکیت تو کسی نہ کسی کی رہی۔ کھیت مجُور بھی وہیں رہے، زمین بھی اسی طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹی رہی، کسان اسی طرح بارش کے لیے آسمان کی طرف دیکھتے رہے۔ کبھی تو ایک بوند نہ برسی اور کبھی آسمان یوں برسا کہ ساری فصل بہا کے لے گیا۔

اور تم جانتے ہو جواہر، ایک کسان کی خوش حالی کتنی ناپائیدار ہوتی ہے۔ ایک سوکھا یا ایک سیلاب آیا اور گھر کی ساری خوش حالی ختم ہو گئی۔ تمہاری بھوجائی فاقے سے مر گئی، رینو بمبئی چلا گیا، گھر کی دیواریں ڈھے گئیں ... . تم نے بہت اچھا کیا جو میرا نیوتہ نہیں مانا۔

مانتے تو آج میں تمہیں چنے کا ساگ اور باجرے کی روٹی بھی نہ کھلا سکتا!

(پنڈت جی اٹھ کر غم اور غصے سے ٹہلنے لگتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کی انگلیاں بے چین ہیں۔ یکایک باہر سے شور سنائی دیتا ہے۔ پنڈت جی غصے سے [illegible] کر پوچھتے ہیں۔)

پنڈت نہرو:

بڑے بھیا، یہ باہر کیسا شور ہو رہا ہے؟

بھگوان دین:

وہ جو ہم پر حکومت کرتے ہیں وہ آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔

پنڈت نہرو:

(پاؤں پٹک کر غصے سے) نان سینس۔

بھگوان دین:

وہ جھگڑتے ہیں اور میرا لحاف پھٹا جا رہا ہے۔

(پنڈت جی خاموشی سے ٹہلتے جاتے ہیں)۔

بھگوان دین:

اور کھیت سوکھے جاتے ہیں۔

وقفہ

بھگوان دین:

اور گاؤں کے گھر گرتے جاتے ہیں۔

وقفہ

بھگوان دین:

اور بچے بمبئی کو بھاگتے جاتے ہیں یا کانپور کو یا احمد آباد کو۔

گاؤں کی گلیوں میں صرف بڈھے رہ گئے ہیں یا اندھے۔

وقفہ

بھگوان دین:

بڈھوں کے لیے کوئی کام نہیں ہے اور بچوں کے لیے کوئی اسکول نہیں ہے۔

پنڈت جی جو اس دوران میں غصے سے ٹہل رہے تھے اور ٹہلتے ٹہلتے ان کے غصے کا پارہ دمبدم بڑھتا جا رہا تھا، یکایک پلٹ کر بھگوان دین کے سامنے آ کر کہتے ہیں۔

پنڈت نہرو:

(How do you expect me to change all this in seventeen years)

سترہ سال میں تمہیں معجزہ کہاں سے لا کے دکھا دیتا؟ غریبی دور کرنے کے لیے میرے پاس الہ دین کا چراغ تو نہ تھا ... پھر بھی ہم کوشش کرتے رہے ہیں۔

جانتے ہو انگلینڈ کو موجودہ خوش حالی حاصل کرنے کے لیے چار سو سال لگے امریکہ کو ڈیڑھ سو سال، روس نے چالیس سال لیئے۔

میں سترہ سال میں کیا کروں؟ اس سے زیادہ؟ .... لوگ جھگڑتے

ہیں، لوگ کام نہیں کرتے، لوگ بے ایمان ہیں، لوگوں کے دل میں دیش کا درد نہیں ہے؛ تو دیش آگے کیسے بڑھے گا۔

It is a problem بڑے بھیا..... لوگوں کو کیسے بدلا جائے۔

یہ بڑا بھاری پرابلم ہے ہمارے سامنے، ہم کیسے بدلیں؟ کیسے آگے جائیں؟ — مگر دھیرے دھیرے کام ہو رہا ہے۔

دھیرے دھیرے ملک میں صنعتیں ترقی کر رہی ہیں۔

دھیرے دھیرے ڈیم بن رہے ہیں۔

دھیرے دھیرے سوکھے کھیتوں میں پانی بھی آجائے گا!...

... ہو تو رہا ہے مگر بہت دھیرے دھیرے....!

بھگوان دین:

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پنڈت نہرو:

دیکھو سوچ کر، اور ایک دن میری خاک سے ہری کونپلیں بھی پھوٹیں گی..... تمہارا کمبل آگیا.... اور نئی جرسی بھی...... انہیں پہن لو۔

بھگوان دین!

نہیں . . . نہیں . . . !

پنڈت نہرو :

پہن لو نا . . . نہیں پہنو گے تو ہم خود پہنا دیں گے۔

شیامو !

تم ان کے ہات پکڑ دیں جرسی پہناتا ہوں، دیکھتا ہوں کیسے نہیں پہنتے ہیں۔

پنڈت جی زبردستی بڈھے کسان کو جرسی پہنا دیتے ہیں اور اس کا پھٹا لحاف الگ کر کے اسے نیا کمبل اوڑھا دیتے ہیں اور خوش ہو کر کہتے ہیں۔

پنڈت نہرو :

دیکھو، اب تو تمہیں سردی نہیں لگ رہی ہے نا؟ اب تو ٹھیک ہے نا؟

بڈھا خوش ہو کر اپنے نئے کمبل کو دیکھتا ہے، اپنی نئی جرسی کو چھوتا ہے اور خوش ہو کر گلوگیر لہجے میں کہتا ہے۔

بھگوان دین :

ہاں یہ کمبل تو بہت اچھا ہے . . . . ہاں یہ اونی بنڈی بھی بہت عمدہ ہے . . . . !

پنڈت نہرو :

شیامو، . . . . اس پھٹے ہوئے لحاف کو باہر پھینک دو۔

(اپڈھانو سے لحاف چھین لیتا ہے)

بھگوان دین :

مگر میرے گاؤں میں ا ہی پھٹے ہوئے لحاف ہوں گے۔

پنڈت نہرو :

اُونہہ ہوں !

بھگوان دین :

تین سو کے قریب پھٹے ہوے لحاف ہوں گے، صرف میرے گاؤں میں اور اگر آس پاس کے گاؤں بھی شامل کیے جائیں ... تو ... ؟

پنڈت نہرو :

اونہہ ہوں۔

بھگوان دین :

اور میرے بیٹے کو سردی کھا کھا کر تپ دق ہو گیا ہے۔

اور دور دور تک ہمارے علاقہ میں کوئی اسپتال نہیں ہے اور جہاں اسپتال ہے وہاں کوئی بستر خالی نہیں ہے۔

باہر کا شور پھر بڑھ جاتا ہے، اب کے جھگڑنے والوں کی آوازیں بھی صاف صاف سنائی دیتی ہیں۔

ایک آواز :

واہ تمہارے دھڑے کے تین وزیر لیے جائیں۔ اور ہمارا صرف ایک۔

آواز ۲:

اور ہمارے دھڑے سے ایک وزیر بھی نہ لیا جائے۔

آواز ۳:

اور تمہارا دھڑا اسپیکر شپ بھی لے جائے۔

آواز ۴:

جو نیا افسر چلا آ رہا ہے، بنارس سے چلا آ رہا ہے۔

آواز ۵:

تو کیا تمہارے سیتا پور سے آئے۔

آواز ۱:

سیتا پور کی ایسی تیسی۔

آواز ۲:

تمہاری ایسی تیسی!

شور بڑھتا جاتا ہے، پھر یکایک کم ہو کر دور ہوتا جاتا ہے، جیسے شور کرنے والے باہر دھکیلے جا رہے ہوں۔

بڈھا بھگوان دین پنڈت نہرو کے قریب آ کر کہتا ہے۔

بھگوان دین:

یہ لوگ سمجھانے سے ٹھیک نہ ہوں گے۔

پنڈت نہرو:

میں زبردستی کرنے کے خلاف ہوں۔

میں لوگوں کی ذہنیت بدلنا چاہتا ہوں چاہے وہ دھیرے دھیرے ہی کیوں نہ بدلے؟

بھگوان دین:

ابھی تو کام دھیرے دھیرے ہو رہا ہے اور میں مانتا ہوں کہ کام ہو رہا ہے۔

مگر جس رفتار سے رشوت ستانی، بے ایمانی، خویش پروری، فرقہ پرستی اور ذات پات کی حمایت بڑھ رہی ہے، اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد یہ دھیرے دھیرے آگے بڑھنے والا کام بھی بند ہو جائے گا.... پھر تم کیا کرو گے؟

پنڈت نہرو:

میں لڑوں گا.... میں لڑوں گا.... میں محبت کے ہتھیار سے لڑوں گا....!

بھگوان دین:

تم بہت بھلے آدمی ہو.... جواہر! بہت نیک آدمی ہو۔

تمہارے دل میں کسی کے لیے برائی نہیں ہے۔ ..... تم چاہتے ہو
کہ بے ایمان، کینہ پرور، منافع خور لوگوں کا دل بھی محبت سے بدل دیا جائے
..... مگر آج وقت بہت کم ہے اور لوگ تین سو سال تک انتظار نہیں
کر سکتے۔

وہ لوگ جو بھوکے ہیں اور ننگے ہیں اور جہالت اور بیماری کے مارے
ہیں، کب تک پتھر سے آنسو نکلنے کا انتظار کریں گے ..... ذرا سوچو...
میرے بھائی!

... ہم دونوں نے آزادی کی خاطر جیل میں عمریں گزاری ہیں... تم
نے اور میں نے ..... یہ دیش تمہارا گھر ہے اور میرا گھر بھی ہے۔

تم لوگوں کو بھگوان بدھ کے راستے پر چلانا چاہتے ہو۔

آج اس دیش کو ایک شنکر آچاریہ کی ضرورت ہے۔

پنڈت نہرو چونک کر بھگوان دین کی طرف دیکھتے ہیں اور کھلی کھڑکی میں
کھڑے ہو جاتے ہیں اور آسمان میں کھلے ہوئے تاروں کی طرف دیکھنے
لگتے ہیں۔

اب ان کی پیٹھ بھگوان دین کی طرف ہے۔

بھگوان دین آہستہ سے مسکراتا ہے، وہ بھی آگے بڑھ کر کھلی کھڑکی
میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

اور اپنا ہات پنڈت نہرو کی کمر میں ڈال دیتا ہے
پنڈت نہرو اس کی طرف دیکھے بغیر آسمان کی طرف تکتے ہوئے کہتے ہیں۔
پنڈت نہرو: کبھی کبھی میں بہت اکیلا پن محسوس کرتا ہوں۔
بھگوان دین:
کبھی کبھی مجھے بھی احساس ہوتا ہے کہ تم بالکل اکیلے رہ گئے ہو۔
تمہیں پرانے دوستوں کی ضرورت ہے، میرے جیسے کسانوں کی...
اور شاید نئے دوستوں کی بھی ضرورت ہے جیسے میرا ہلیٹا دینو ہے جو کانپور
کے کارکھانے میں کام کرتا ہے...!
پنڈت نہرو:
میں تھک گیا ہوں، مجھے سردی لگ رہی ہے، بڑے بھیّا۔
اپنا لحاف مجھے دے دو۔
بھگوان دین:
ہاں، میرا پھٹا ہوا لحاف اوڑھ لو۔ اس میں تین پشتوں کی ترسی ہوئی
آرزوئیں بند ہیں.... یہ لحاف اوڑھ لو، اور میرے گاؤں چلو، چلو...
..... جواہر۔
کیونکہ صبح دم ہوا کے پہلے جھونکے کی طرح اور امڈی ہوئی گھٹاؤں کے
پہلے قطرے کی طرح لوگ ہر جگہ کھیتوں میں تمہارا انتظار کرتے ہیں!

پنڈت نہرو وہ پھٹا ہُوا لحاف اوڑھ لیتے ہیں اور بھگوان دین کے ہات میں ہات دے کر کھڑکی سے پلٹ کر بھگوان دین کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ سارے کمرے میں اندھیرا چھا جاتا ہے، صرف بھگوان بدھ کی مورتی پر روشنی کی ایک ہلکی سی چھوٹ پڑ رہی ہے!

پردہ

شادی

سے

متعلق

رشتے کی ضرورت

سیٹھ جوکھم داس اپنے وسیع کیبن میں ساگوان کی ایک عمدہ میز سامنے رکھے ایک گھومنے والی کرسی پہ بیٹھے ہیں۔

ان کے بالکل قریب سیٹھ جوکھم داس کا چھوٹا بھائی سیٹھ لوکھم داس بیٹھا ہے۔ دونوں کے چہروں پہ بھائیوں والی مشابہت پائی جاتی ہے۔

لباس ایک سا ہے۔ وضع قطع ایک سی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سیٹھ جوکھم داس عمر میں بڑا دکھائی دیتا ہے اور لوکھم داس اس کا چھوٹا ایڈیشن معلوم ہوتا ہے۔

سیٹھ جوکھم داس کے دائیں طرف ذرا فاصلے پہ اس کا پرائیویٹ سیکرٹری بیٹھا ہے۔

ایک فائل آگے بڑھاتا ہے۔

سیٹھ جوکھم داس فائل دیکھ کر اپنے چھوٹے بھائی کی طرف مڑ کر کہتا ہے۔

لوکھم ؟

جی بھو کھم !

اس فائل میں سات سو عرضیاں ہیں۔ لڑکی والوں کی جو اپنی بیٹی کی شادی میرے بیٹے گھوگھم داس سے کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے اس میں سے صرف سات عرضیاں چھانٹی ہیں اور آج انہیں انٹرویو کے لیے بلایا ہے۔

لوکھم :

(خوش ہو کر) لڑکیوں کو ؟

(فوراً اپنے سر کی پگڑی وغیرہ ٹھیک کرنے لگتا ہے)

جوکھم :

لڑکیوں کو نہیں ان کے باپ کو۔

لوکھم :

اوہ !

(ہونٹ لٹک جاتا ہے)

جوکھم :

میں باری باری ہر ایک کا انٹرویو لیتا جاؤں گا۔ تم غور سے سب کچھ

دیکھتے اور سنتے جاؤ اور تم (سیکرٹری سے مخاطب ہو کر) سب سوال جواب نوٹ کرتے جاؤ۔

سیکرٹری :

ست بچن!

جوکھم :

(فائل سے ایک عرضی نکال کے سیکرٹری کو تھما کے)

اس عرضی والے کو بلاؤ۔

(سیکرٹری عرضی لے کر ایک لمحہ کے لیے خاموشی سے اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ پھر بڑی پھرتی سے ایک بٹن دباتا ہے، باہر گھنٹی ہوتی ہے۔ ایک چپراسی اندر آتا ہے)۔

سیکرٹری :

شری بھیکم داس کو اندر بھیجو۔

چپراسی لوٹ جاتا ہے۔

چند لمحوں کے بعد کیبن میں شری بھیکم داس داخل ہوتا ہے۔ چہرے بشرے سے ملنے جلنے کے انداز سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی والا ہے۔

جوکھم داس :

بھیکم داس جی۔

آپ بھی جانتے ہیں کہ میں نے آپ کو کیوں بلایا ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔ لہذا بیکار کی باتوں میں وقت ضائع نہ کرتے ہوئے میں اصلی مطلب کی بات پہ آتا ہوں۔

میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور آپ کا وقت بھی بہت قیمتی ہوگا، اس لیے نہایت مختصر گفت گو ہوگی۔

آپ کم سے کم الفاظ میں میرے سوالات کا جواب دیتے جائیے۔ میرا سیکرٹری سب گفت گو نوٹ کرے گا۔ بعد میں فیصلہ سے آپ کو آگاہ کر دیا جائے گا۔

کہیئے یہ طریقہ منظور ہے؟

بھیکم داس:

جی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

جوکھم داس:

بہت خوب! — اچھا — تو ہاتھ میں پنسل لے کر اسے گھماتے ہوئے لڑکی کا نام؟

بھیکم:

مینا کماری

مگر گھر میں سب لوگ اسے پیار سے مینا کہتے ہیں۔

لوکھم :
مینا بہت پیارا نام ہے۔
جوکھم :
لوکھم ۔
لوکھم :
جی جوکھم ۔
جوکھم : تم چپ رہو۔
لوکھم : (سہم کر) بہت اچھا۔
بیسکرٹری : (لکھتے ہوئے) مینا کماری عرف مینا!
جوکھم :
عمر ؟
بھیکم :
بیس سال ۔
جوکھم :
رنگ ؟
بھیکم :
جناب میری بیٹی کا رنگ گو سانولا ہے لیکن اس نے پچھلے سال

نینی تال کی نمائش کے موقع پر بیوٹی کمپیٹیسن میں فرسٹ پرائز حاصل کیا ہے۔

لوکھم :

مجھے خود سفید رنگ کی عورت پسند نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ دلہن کے بجائے شلجم کھا رہے ہیں۔

جس رنگ میں نمک نہ ہو وہ رنگ پھیکا ہے۔ جس حسن میں ملاحت نہ ہو وہ حسن سیٹھا ہے۔

جوکھم :

لوکھم ؟

لوکھم :

جی جوکھم !

جوکھم :

شادی تمہاری نہیں ہو رہی ہے، گھوگھم کی ہو رہی ہے۔

لوکھم :

اوہ !

جوکھم :

لڑکی کا ٹائٹل کیا ہے ؟

بھیکم :

پانچ فٹ تین انچ۔

جوکھم :
کمر ؟

بھیکم : کمر چھبیس انچ، سینہ پینتیس انچ، کولھا سینتیس انچ، وزن
ایک من تیس سیر، تعلیم نو جمع دو گیارہ جماعت۔

جوکھم :
اوہ !
آپ کو تمام اعداد و شمار خوب یاد ہیں۔

بھیکم :
اکثر جگہ انٹرویو پہ جانا پڑتا ہے اس لیے یہ اعداد و شمار از بر ہو چلے ہیں

جوکھم :
اچھا ہے اس سے وقت بچ جاتا ہے اور آجکل بزنس میں وقت ہی
روپیہ ہے۔
ہاں !
اس سے خوب یاد آیا، آپ کتنا انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں ؟

بھیکم :
ایک لاکھ پچپن ہزار سالانہ۔

جوکھم :

سیکریٹری، نوٹ کرو۔

سیکریٹری :

ست بچن۔

جوکھم :

سیٹھ بھیکم داس جی، آپ کی لڑکی بات چیت میں کیسی ہے ؟

بھیکم :

جیسے لڑکیاں بات چیت کرتی ہیں، شرما کے۔

جوکھم :

میرے بیٹے گھوگھم داس کو شرمیلی لڑکی پسند نہیں ہے۔

بھیکم :

یہ پرائز اس نے آج سے چار سال پہلے حاصل کیا تھا، اب تو وہ بہت کم بات کرتی ہے۔

جوکھم :

گوشت کھاتی ہے ؟

بھیکم :

جی نہیں۔

جوکھم:
مگر میرا بیٹا تو گوشت کھاتا ہے۔
بھیکم:
تو وہ بھی کھالے گی۔
جوکھم: مگر اسے گوشت کھانے والی لڑکی پسند نہیں۔
بھیکم:
تو وہ نہیں کھائے گی۔
جوکھم:
مگر اسے ایسی لڑکی پسند ہے جو خود گوشت نہ کھائے مگر دوسروں
کے لیے پکا دے۔
بھیکم:
وہ ماس، مچھلی، انڈا، مرغی سب پکانا جانتی ہے۔ کھڑے مصالحہ
کا قورمہ، میٹھے مصالحہ کا روغن جوش، نرگسی کوفتے اور لکھنوی کوفتیاں
شامی کباب اور ایرانی پلاؤ سب پکانا جانتی ہے۔
جوکھم:
آپ تو ایسے بات کرتے ہیں جیسے وہ کسی ہوٹل میں باورچن رہ
چکی ہو۔

بھیکم :

ہوٹل کی باورچن تو نہیں۔ ہوٹل کی مالک ضرور ہے۔ میں مائی لارڈ ہوٹل کا مالک بھی ہوں، میری بیوی کے ناطے سے مینا کا اس میں حصہ ہے۔

جوکھم :

مائی لارڈ ہوٹل آپ کا ہے ؟

بھیکم :

جی ہاں !

جوکھم :

مائی گاڈ ! آپ نے پہلے نہیں بتایا۔

بھیکم :

سیکرٹری ،

نوٹ کرو مائی لارڈ ہوٹل آپ کا ہے۔

لوکھم : مائی لارڈ ہوٹل میں آجکل ایک نئی کیبرے گرل آئی ہے۔ مس جین الپا کا عورت ہے یا بم کا دھماکہ ۔۔ کیا آپ اسے جانتے ہیں ؟

جوکھم :

لوکھم ؟

لوکھم :

جی جو حکم — جی بہت اچھا — جی اب میں کچھ نہیں کہوں گا۔

جو کھم:

معاف کیجئے گا سیٹھ بھیکم داس جی، آپ کو بہت تکلیف دی۔
کل بذریعہ ٹیلی فون آپ کو اپنے فیصلے سے مطلع کروں گا۔
ہاں عزیز گھو گھم داس کے بارے میں اگر آپ کچھ دریافت کرنا چاہتے ہوں۔ تو ضرور دریافت کر سکتے ہیں (گھڑی دیکھ کر) میں آپ کو اس کے لیے دو منٹ دوں گا۔

بھیکم:

جی نہیں، مجھے سب معلوم ہے۔ عزیز گھو گھم بمبئی کے سب سے بڑے رئیس اور بزنس مین کا بیٹا ہے۔ نریں فیل ہے، ہکلاتا ہے۔ بیحد عیاش اوباش اور خرچیلا ہے۔ غرضیکہ مکمل احمق ہے۔

جو کھم:

(چونک کر) — احمق ہے..... آپ جانتے ہیں.... پھر بھی اپنی بیٹی کی شادی میرے لڑکے سے کرنا چاہتے ہیں، کیوں؟

بھیکم:

کیوں کہ آجکل ہر شادی ایک بزنس پرا پوزیشن ہوتی ہے۔ میں اپنی ملنا کی شادی عزیز گھو گھم سے نہیں کر رہا ہوں۔ میں اپنی لڑکی کی شادی سب سے

بڑی بزنس کارپوریشن سے کر رہا ہوں۔

جوکھم:

ہاتھ ملائیے سیٹھ بھیکم داس جی، آپ کی صاف گوئی مجھے بہت پسند آئی ہے۔

میں کل صبح دس بجے آپ کو ٹیلی فون کروں گا، ضرور کروں گا۔

بھیکم:

اوکے..... نمسکار!

جوکھم، لوکھم:

نمسکار۔

جب بھیکم کمرے کے دروازے سے باہر چلا جاتا ہے۔ تو جوکھم اپنے سیکرٹری کی طرف مڑ کر کہتا ہے۔

جوکھم:

Next Please

سیکرٹری دوسری عرضی پہ نظر ڈال کر بٹن دباتا ہے۔

چپراسی اندر آتا ہے، سیکرٹری اس سے کہتا ہے۔

سیکرٹری:

شری جوکھم داس کو اندر بھیج دو۔

پھر اسٹی چلا جاتا ہے، چند لمحوں کے بعد شری جوحکم داس اندر آتے ہیں۔

جوکھم داس:

تشریف رکھیئے (جوحکم داس بیٹھ جاتا ہے)۔

جوکھم: آپ کا نام؟

جوحکم داس:

جوحکم داس۔

لوکھم:

پہلے بھیکم داس آئے تھے۔ اب جوحکم داس آگئے ہیں۔ آج جو آتا ہے داس ہی آتا ہے۔

جوحکم داس:

دنیا میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک جو باس BOSS ہوتے ہیں دوسرے جو داس ہوتے ہیں۔

لوکھم:

اور جو اس تفریق کو نہ مانیں؟

جوحکم داس:

وہ نہ باس ہوتے ہیں بلکہ سماج کے اصطبل کی گھاس ہوتے ہیں۔

جوکھم:

(کھانس کر) اس قسم کے سب جھمیلے بکواس ہوتے ہیں۔ (پھر کھانس کر)
شری جوھکم داس جی، آپ بھی جانتے ہیں۔ میں نے آپ کو کیوں بلایا ہے،
اور میں بھی جانتا ہوں کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔
لہٰذا بے کار کی باتوں میں وقت ضائع نہ کرتے ہوئے میں اصلی مطلب
کی بات پر آتا ہوں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور آپ کا وقت بھی
قیمتی ہوگا، اس لیے نہایت مختصر گفت گو ہوگی۔
آپ کم سے کم الفاظ میں میرے سوالات کے جواب دیتے جائیے۔
میرا سیکرٹری گفت گو نوٹ کر لے گا۔ بعد میں فیصلہ سے آپ کو آگاہ کر
دیا جائے گا، کہیئے یہ طریقہ منظور ہے؟

جوھکم داس:
جو حکم۔
جوکھم:
اچھا تو سب سے پہلے نام بتائیے:
جوھکم داس:
نام اس کا شینا ہے۔
جوکھم:
قد؟

جو حکم داس:

قد بوٹا سا ہے، نہ بہت اونچا نہ بہت چھوٹا۔ بلکہ ایسا کہ اگر ڈرائنگ روم میں دیکھئے تو ڈرائنگ روم کی ساری سجاوٹ اسی سے ہو اور اگر بیڈ روم میں دیکھئے تو بیڈ روم کا مرکز معلوم ہو۔

جو کھم:

رنگ کیسا ہے؟

جو حکم داس:

سنہری۔ نہ کالا نہ سانولا، نہ گندمی نہ گورا۔ یہ سب رنگ آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکے ہیں۔

اس کا رنگ تو بالکل سونے کا سا دمکتا ہوا ہے۔

دیکھئے گا تو غش کھا جیئے گا۔

جو کھم:

خدوخال؟

جو حکم داس!

خدوخال میں ہماری شینا کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بہترین سے بہترین مغربی ماڈل اس کے آگے پانی بھرتے ہیں۔

اس کی چھب، بانکپن اور خطوط کی نازکی اجنتا کی سندرتا کو مات

کرے ہے۔

جوکھم :

گاتی بھی ہیں؟

جوحکم داس :

گانو تو صاحب جس زبان کا چاہے سن لیجئے۔ اک ذرا اشارے کی دیر ہے۔

ہندی اور گجراتی، میراٹھی بنگالی، سنہالی، تامل، تانگو، جس زبان کا گانا چاہے سن لیجئے اور جس رنگ کا جو چاہے داورا دھرپد، خیال، ٹھمری فلمی توالی، بھجن، کیرتن جو چاہے سنیئے۔

جوکھم :

میرے لڑکے کو گانے کا بہت شوق ہے وہ بالکل ایسی ہی چاہتا ہے

جوحکم داس :

جو حکم، میں تو اسی لیے حاضر ہوا ہوں۔

جوکھم :

اور تعلیم؟

جوحکم داس :

تعلیم؟ عجیب سوال کیا آپ نے — خیر — تعلیم کا بھی انتظام

ہے اور یہ تو انسان کے اپنے ذوق پر منحصر ہے کہ وہ کس قسم کی تعلیم و تربیت
چاہتا ہے ورنہ جہاں تک ہماری شینا کا تعلق ہے آپ اس سے انگریزی
میں تقریریں سنیں، ہندی میں، فرنچ میں، وہ ادب، تاریخ، فلسفہ، پالٹیکس
کسی میدان میں بند نہیں ہے۔

جوکھم:

وزن کے بارے میں کچھ بتایا نہیں آپ نے؟ میرے لڑکے کو بھاری
بھرکم پسند نہیں آتیں۔

جوحکم داس:

اجی آجکل کسی کو پسند نہیں آتیں سیٹھ جی۔ زمانہ بدل گیا ہے آجکل تو
ہر شخص latest design اور سٹریم لائن صورت پہ فدا ہے۔
ہماری شینا بھی بالکل جدید مشین کی ہے۔

جوکھم:

مگر وزن؟

جوحکم داس:

کہہ تو رہا ہوں حضور وزن صرف ایک سو بیس پاؤنڈ ہے۔
ایسی ہلکی، سبک اور نازک اندام ہے کہ جب جی چاہے گود میں اٹھا کر
ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں لے جائیے (جیب سے سگریٹ نکال

کر سلگانے لگتا ہے)۔

جوکھم :

لوکھم ؟

لوکھم :

جی جوکھم ۔

جوکھم : (سرگوشی میں) ابھی جو صفات یہ بیان کر رہا ہے۔ اس سے آدھی بھی اگر لڑکی میں موجود ہوں تو فوراً رشتہ کر لیجیے۔

جوکھم :

میرا بھی ایسا خیال ہے (مڑ کر جو حکم داس سے) معاف کیجیے گا، ایک ضروری بات پوچھنا بھول گیا ہوں۔ آپ انکم ٹیکس کتنا ادا کر رہے ہیں ؟

جو حکم داس :

انکم ٹیکس — مگر انکم ٹیکس سے شبنا کا کیا تعلق ہے ؟

جوکھم :

دیکھئے یوں تو کوئی تعلق نہیں ہے۔

لڑکی سے تو کوئی تعلق نہیں ہے مگر آپ جانتے ہیں اس قسم کی باتوں میں حسب نسب بھی دیکھا جاتا ہے۔

جو حکم داس :

اوہ — سمجھا — خوب سمجھا! — اجی جناب سیٹھ جوکھم داس صاحب! آپ یہ معاملہ کسی للّو پنجو سے نہیں کر رہے ہیں۔

ہماری فرم گزشتہ پچاس سال سے اسی بمبئی میں کام کر رہی ہے۔ سارے دفاتر بمبئی کے علاوہ کلکتہ، مدراس، بنگلور، دہلی اور ناگپور میں بھی ہیں.... ہمارا ہیڈ آفس نیو یارک میں ہے، ایک فیکٹری لندن میں بھی ہے، ہم کتنا انکم ٹیکس دیتے ہیں اس کا کل اندازہ کرنا تو مشکل ہے کیونکہ ہم صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ دنیا کے دس ملکوں میں انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں اور جو رقم ہم نے اس سلسلے میں گزشتہ سال ادا کی ہے اس کی مالیت دو کروڑ روپے سے کم نہ ہوگی۔

جوکھم:

دو کروڑ روپے؟

جوکھم داس:

جی ہاں!

جوکھم: لوکھم؟

لوکھم: جی جوکھم!

جوکھم:

(سرگوشی میں) میرے خیال میں یہ معاملہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

لوکھم:

(سرگوشی میں) فوراً ہاں کر دیجئے۔

سیٹھ جوحکم داس اپنے چھوٹے بھائی سے گفت گو کر کے جوحکم داس کی جانب پلٹتا ہے تو جوحکم داس سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہتا ہے۔

جوحکم داس:

کہیئے، کچھ اور پوچھنا ہو تو پوچھ لیجئے، اپنے دل کے سارے شبہات مٹا لیجئے۔

جوکھم:

جی نہیں۔

اب نہ کچھ پوچھنا ہے، نہ کہنا ہے نہ سننا ہے نہ ہمارے دل میں کوئی شک شنکا باقی ہے ہمیں تو منظور ہے۔

جوحکم داس:

آپ کو منظور ہے تو مجھے بھی منظور ہے۔

جوکھم:

تو ملائیے ہات۔

جوحکم داس:

(ہات ملا کر) جوحکم۔

جوکھم:
اب فرمائیے منگنی کی کونسی تاریخ مقرر کی جائے؟

جوحکم داس:
منگنی؟ — کیسی منگنی؟

جوکھم:
آپ بھی خوب مذاق کرتے ہیں سیٹھ جی، بھلا شادی سے پہلے منگنی نہیں ہوتی؟

جوحکم داس:
شادی؟ کس کی شادی؟

جوکھم:
آپ کی لڑکی کی میرے لڑکے سے شادی۔
میں نے اس سلسلے میں آج لوگوں کو انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔

جوحکم داس:
مگر میری تو کوئی لڑکی ہی نہیں ہے۔

جوکھم:
لڑکی نہیں ہے۔
توپھر اب تک یہ گفت گو کس سلسلے میں ہوتی رہی ہے یہ شیا کون ہے؟

بوحکم داس :

شینا ؟ ــــ اوہ ــــ شینا تو ریڈیو گرام ہے ۔

میں شینا ریڈیو گرام مشین کمپنی کا ایجنٹ ہوں ۔

میں اپنی مشین بیچنے آیا تھا . . . . کسی لڑکی کا سودا کرنے نہیں آیا تھا .

. . . . . معاف کیجئے گا ، غلط فہمی ہوگئی ۔

لوکھم داس ، جوکھم داس ، سیکرٹری سب ہکا بکا ہوکر بوحکم داس کی طرف دیکھتے ہیں ۔ بوحکم داس اپنی ٹوپی میز سے اٹھا کر سر پر پہن کر افسوس سے سر ہلاتے ہوئے چلنے لگتا ہے ۔

(پردہ)

———✣———

غیر انسانی

ظُلم و سِتم

خالی قبر

خزاں کے پہلے دن تھے۔

صبح کا میلا کہرہ قیدیوں کی بیرکوں پہ چھایا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا میں کسی گندی گالی کی سی تیزی اور تلخی تھی۔ لنڈین کے پیڑوں کے آخری پتے سر جھکائے اپنی آخری گھڑی کے انتظار میں تھے اور انسانی لاشوں کو جلانے والی بھٹیاں آہستہ آہستہ دھواں اگل رہی تھیں۔

لیون نے اپنی قبر کھودتے کھودتے سر اٹھا کر پوپلر کے لمبے پیڑوں کی قطاروں کو دیکھا جن کے سفید رنگ تنوں سے یہودی قیدیوں کو باندھ کر گولی ماردی جاتی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے اس کی سانس بند پرندے کی طرح اس کے سینے کے پنجرے میں رکی، پھر گھٹ کر آہ کی صورت میں باہر نکل آئی۔ اس ٹھٹھری ہوئی سانس سے اس کی چھاتی دہل گئی۔ مگر گشت کرتے ہوئے نازی

سپاہیوں کی چاپ میں کسی طرح کی لغزش پیدا نہ ہوتی۔ وہ اسی پابندی اور مضبوطی سے ان یہودی قیدیوں کے چاروں طرف گشت کرتے رہے۔ جنہیں آج گولی ماری جانے والی تھی اور جو اس وقت نازی سپاہیوں کی نگرانی میں کدالیں اور بیلچے لیے اپنی اپنی قبر کھود رہے تھے۔

لیون کی نظر پوپلر کے پیڑوں سے بھی اوپر پھیلے کہرے میں گھلتی ہوئی دھوئیں کی اس لکیر کو دیکھنے لگی جو کل تک کسی محبوبہ کی مہکتی ہوئی سانس تھی۔ کسی معصوم بچے کی مسکراہٹ تھی، کسی محبت کرنے والے سائنس دان، فلسفی اور ادیب کا دماغ تھی۔ آج ان سب کی جگہ دھوئیں کی ایک لکیر تھی جو جلنے والی بھٹیوں کی چمنیوں سے نکل کر کرۂ ہوائی میں بکھر چلی تھی۔

جب قبریں کافی گہری ہو چکیں، تو نازی سارجنٹ زور سے چلّایا۔

"کام بند کرو۔"

سارے قیدیوں نے اپنی قبروں کے سامنے کدالیں اور بیلچے رکھ دیئے اور اٹینشن ہو کر کھڑے ہو گئے۔

"فارورڈ مارچ!" نازی سارجنٹ بڑے سخت لہجہ میں چلّایا۔

لیون کے قدم مشین کی طرح پوپلر کے پیڑوں کی طرف بڑھنے لگے، جہاں کچھ منٹ کے بعد اسے گولی ماردی جائے گی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی موت کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے پیچھے دوسرے یہودی قیدی تھے۔ جو جگہ جگہ سے

لاکرلودر کے نازی جیل خانے میں بند کیے گئے تھے۔ ان میں اس کا دوست اور ساتھی ابراہیم بھی تھا جو سائنس دان تھا اور کینسر کے مرض پر ریسرچ کر رہا تھا۔ سفید داڑھی والا بوڑھا ابراہیم آج تک یہ نہ سمجھ سکا۔ کہ اسے کس جرم کی پاداش میں گولی ماری جارہی ہے۔ وہ ہولے ہولے معصوم بچوں کی طرح روتا ہُوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے اس کی دو نوجوان لڑکیاں ا بنتھل اور روزلا سولہ اور اٹھارہ سال کی دوشیزائیں سر اونچا کیے بے خوفی سے چل رہی تھیں ان کے پیچھے اور بھی یہودی تھے جو دوسری بیرکوں سے لائے گئے تھے اور جنہیں لیون پہچانتا نہ تھا۔ سب سے آخر میں اس کی محبوبہ جیّن تھی۔ کاش یہ نازی سپاہی اتنی سی مہربانی سے کام لیتے کہ اس کی محبوبہ کو اس کے ساتھ ساتھ موت کی طرف آخری گھڑیوں میں چلنے دیتے۔ لیکن نازیوں نے اس کی یہ معمولی سی درخواست بھی ٹھکرادی تھی۔ سب سے آخر میں تین سال کا ایک بچہ چل رہا تھا۔ جس کے یہودی ماں باپ کو دو دن ہوئے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تھا۔ وہ بچہ ایک ہات جیّن کے ہات میں دبے اور دوسرے ہات کا انگوٹھا اپنے منہ میں چوستا ہُوا چل رہا تھا ۔۔۔ اپنی زندگی کے آخری ایام سے بے خبر۔

یکایک چلتے چلتے لنڈین کے نیچے سے گزرتے ہوئے کہیں دور اوپر کی شاخوں میں ایک پتہ کھڑکھڑایا۔ اور تیز ہوا کے جھونکے سے ٹوٹ کر زمین پر آگرا۔

ننھے بچے نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور زمین پر لڑھکتے ہوئے پتے کی طرف بھاگنے لگا۔ جبین نے اسے روکنا چاہا، دوسرے قیدیوں نے بھی اسے آوازیں دیں۔ مگر کھلکھلاتا ہوا بچہ لائن توڑ کر ہرے پتے کی طرف بھاگتا جا رہا تھا۔ پتہ آگے آگے لڑھکتا ہوا جا رہا تھا اور بچہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا جا رہا تھا۔ آخر خوشی سے چیختے ہوئے اس بچے نے جھپٹ کر اس پتے کو اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا۔

ٹھیک اسی وقت پیٹھ پر ایک گولی لگی اور وہ وہیں زمین پر گر گیا۔

اس کے ہاتھ میں وہی ہرا پتہ تھا اور یہی آخری پتہ تھا جو تین سال کے بچے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

یہودی قیدیوں کی قطار میں غم اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ مگر نازی سپاہی رائفلیں تانے ان کے بالکل پاس آ گئے اور بے بس و مجبور قیدی سر جھکا کر پھر پوپلر کے پیڑوں کی طرف بڑھنے لگے۔

لیون کے بالکل قریب بوڑھے سائنس داں ابراہیم کو باندھا گیا۔

سب سے آخر میں جبین کو باندھا گیا — جبین جو اس کی محبوبہ تھی، بھوری آنکھوں والی، بہادر جبین، جس کے ہونٹوں پر سرخ لپ سٹک چمک رہی تھی پر کسی نخرے والی عورت کی ادا نہیں تھی، یہ موت کے خلاف ایک معصوم اور بہادر لڑکی کی بغاوت کا اعلان تھا۔

جب سب یہودی پیڑوں سے باندھ دیے گئے تو نازی سپاہیوں نے اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو کر رائفلیں تان لیں۔

ٹھیک اسی وقت ایک سپاہی بھاگتا ہوا آیا اور سارجنٹ سے کہنے لگا "لاش جلانے والی بھٹیوں پر ایک آدمی کم پڑ گیا ہے اور نئے قیدی تو کل آئینگے"

سارجنٹ نے بات کے اشارے سے سپاہیوں کو گولی مارنے سے روک دیا اور خود گھوم کر پیڑوں سے بندھے ہوئے ایک ایک قیدی کو دیکھنے لگا۔ ہر قیدی اس کی نگاہوں کے نیچے کانپ رہا تھا۔ یہ سارجنٹ ایک کو ایک دن کی زندگی دے سکتا ہے۔ جانے وہ کون خوش قسمت ہو گا۔

سارجنٹ کی وہ بے رحم نظر سب قیدیوں پر سے پھسلتی ہوئی آخر لیون کے چہرے پر رک گئی۔

لیون نے چلّا کر کہا: "نہیں سارجنٹ، مجھے نہیں! یہ دن تم جین کو دے دو۔ ابراہم کو دے دو۔"

"ایک ہی تو دن ہے۔" نازی سارجنٹ نے بے حد نفرت کے ساتھ کہا۔ "ایک ہی تو دن ہے!" لیون سوچنے لگا۔ مگر ایک دن میں کتنی سانسیں ہوتی ہیں، کتنے منٹ، کتنے سیکنڈ، کتنے خیال، کتنے تصور! ایک دن کے دامن میں کتنی آرزوئیں، کتنی حسرتیں، کتنے پھول، کتنی کلیاں کھل جاتی ہیں۔ ایک دن پوری زندگی، پوری صدی، پوری تاریخ بن سکتا ہے۔ مگر اندھے شعور کی تھپڑ یلی

گھاٹیوں میں گشت کرتا ہوا نازی سپاہی کیا جانے کہ ایک دن میں کیا ہوتا ہے۔

لیون نے اسی لمحہ بھر میں کھڑے کھڑے یوں سوچا اور ملتجی نگاہ سے سارجنٹ کی طرف دیکھنے لگا۔

مگر نازی سارجنٹ نے اس کی یہ التجا بھی ٹھکرا دی۔ "جین ایک لڑکی ہے۔" وہ بولا۔ "اور ابراہم بوڑھا ہے۔ لاشیں جلانے والی بھٹی پر ایک مضبوط آدمی کی ضرورت ہے ۔۔۔۔ ولیم!" نازی سارجنٹ نے دھاڑ کر اپنے ایک سپاہی سے کہا "لیون کی رسیاں کھول دو۔"

کچھ منٹ کے بعد وہ بھٹی نمبر ۲ پر کام کرنے لگا۔ لاشیں جلانے والی بھٹیاں کینسنٹریشن کیمپ کے پچھلے سرے پر تھیں اور اس سے پچاس ساٹھ گز کی دوری پر جیل خانے کا لوہے کا جنگلا تھا۔ اس جنگلے کے باہر بھی چاروں طرف نازی سپاہی پہرہ دیتے اور گشت کرتے تھے۔ مگر آج کہرا اتنا گہرا تھا کہ لوہے کے جنگلے کا ٹیڑھا میڑھا جال آدھے سے زیادہ کہرے میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا اور نازی سپاہیوں کے چہرے کچھ لمحوں کے لیے کہرے میں ڈوب کر ابھرتے اور پھر اسی کہرے میں کھو جاتے تھے۔

پچاس گز کی دوری پر آزادی ہے۔ لیون بھٹی میں لاشیں جھونکتے جھونکتے سوچنے لگا ــ صرف پچاس گز کی دوری پر! اس کے ساتھ دو نازی سپاہی بھی کام کر رہے تھے اور تین یہودی۔

وہ ہرا پتہ پھر لیون کی آنکھوں میں لہرانے لگا جیسے اسے اپنے پاس بلا رہا ہو زندگی کا پیغام دے رہا ہو۔

مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ لیون کام کرتا رہا اور سوچتا رہا۔ پھر بھٹی میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی اور ایک نازی سپاہی مدد کے لیے وہاں چلا گیا۔

اب صرف ایک نازی سپاہی تھا اور چار یہودی قیدی تھے۔ ان سب قیدیوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے ایک ہی خیال ایک وقت پر ان چاروں کے ذہن میں ابھرا ہو۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے اور وہ سب قیدی اب پہلے سے بھی زیادہ محنت اور لگن سے کام کرنے لگے اور کام کرتے کرتے نازی سپاہی کے نزدیک تر ہوتے گئے۔

نازی سپاہی نے ایک لمحہ کے لیے بھٹی کے اندر جھانک کر دیکھا اور کہا۔ "بس ٹھہر جاؤ۔ اب اندر جگہ نہیں ہے۔"

ٹھیک اسی وقت لوہے کے پنجے کی طرح ایک مضبوط ہاتھ نے اس کے منہ کو بڑی سختی سے ڈھک دیا۔ اس نازی سپاہی کے منہ سے چیخ تک نہ نکل سکی۔ پھر ان سب قیدیوں نے اسے اٹھا کر بھٹی میں جھونک دیا اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

پھر وہ پچاس گز کی دوری پر لوہے کے جنگلے کی طرف بھاگے۔
دھند گہری اور موٹی تھی۔ کہرا میلا اور گندا تھا۔ لوہے کے تاروں کے

جال سے قیدی مچھلیوں کی طرح نکل نکل کر بھاگنے لگے۔ اتنے میں گشت کرنے والے سپاہی نے انہیں دیکھ لیا۔ خطرے کا سائرن زور زور سے بجنے لگا۔ رائفلیں تانے نازی سپاہی دوڑنے لگے اور چاروں طرف ہلہ ہو گیا۔

لیون گہری دھند میں بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں سنسناتی ہوئی گولیاں نکل گئیں۔ مگر وہ ایک ہی جانب بھاگتا رہا۔ مغرب کی طرف فر کے پیڑوں کا بہت بڑا ایک جنگل تھا۔ اگر وہ کسی طرح وہاں پہنچ جائے۔

جنگل کے اندر دور تک جا کر وہ گھاس پہ گر پڑا۔ پھر کچھ پلوں کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے۔ اب صرف اسے اتنا یاد تھا کہ بیہوش ہونے سے پہلے اس کے افق پہ ایک ہرا پتہ چمکا تھا۔

کئی مہینے تک وہ ایک روسی کسان کے گھر میں چھپا رہا۔ اس زمانے میں نازیوں کی مقبوضہ لائن میں کسی یہودی کو پناہ دینے کی سزا موت تھی۔ مگر اس بہادر کسان نے بڑی دلیری سے اس خطرے کا مقابلہ کیا اور لیون کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ پھر جب لگاتار روسی حملوں سے نازی فوجیں یوکرین سے بھاگنے پر مجبور ہو گئیں تو واپس جاتے ہوئے سارے پچھلے گاؤں اور ان کے گھروں کو جلاتے لوٹتے اور تباہ کرتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگیں۔ نازی فوجوں کے بھاگتے وقت لیون بدقسمتی سے پھر پکڑا گیا

نازیوں نے اسے پناہ دینے والے روسی کسان کو اسی وقت گولی سے اڑا دیا اور لیون کو پھر لودو کے نازی جیل خانے میں بھیج دیا۔

مگر اس بار جیل خانے میں کسی نے لیون کو نہ پہچانا۔ ایک تو کئی مہینوں کی بڑھی ہوئی داڑھی اس کے چہرے پر تھی۔ لگاتار مصیبتیں جھیلنے اور بھوکے رہنے کی وجہ سے اس کی صحت بہت گر گئی تھی۔ جیل خانے کا ڈھنگ بھی اب بدل چکا تھا۔ یوکرین سے پیچھے ہٹتے وقت ہٹلر نے حکم دیا تھا کہ کنسنٹریشن کیمپوں کے سارے نشان مٹا دیے جائیں۔ تاکہ دنیا کو ہٹلر شاہی کے ظلم و ستم کا ثبوت نہ مل سکے۔

نازی سارجنٹ کاسٹیل ایک فہرست لے کر لیون کے پاس آیا اور بولا: "جوزف! (کیونکہ لیون نے اب کے اپنا نام بدل لیا تھا) تمہارے گروپ میں دس یہودی ہیں۔ اور اس فہرست میں ۱۸۲ یہودی قیدیوں کے نام ہیں جنہیں سلسلہ وار ۱۸۲ قبروں میں گاڑا گیا ہے۔ تم لوگوں کو ہر قبر کو کھودنا ہوگا اور پہچان کے لیے ہر لاش کے ساتھ قبر میں جو کارڈ دفن ہے، اسے نکال کر فہرست سے چیک کرنا ہوگا اور چیک کرنے کے بعد گڑے مُردوں کی لاشوں کو باہر نکال کر بھٹی میں جلا دینا ہوگا اور اس قبر کو پاٹ دینا ہوگا کہ اس کا نام و نشان بھی کسی کو نہ ملے اور یہ سب کام چار دن میں ختم کر دینا ہوگا۔"

"چار دن تو بہت کم ہوں گے صاحب!" جوزف یعنی لیون نے سر

جھکا کر بڑے ادب سے کہا:
"تو ایک دن اور لے لو، ایک دن اور کیا ہوتا ہے!" سارجنٹ کائیٹیل نے بڑی لاپروائی سے کہا۔
"ایک دن اور!" لیون نے بڑے دھیان سے سوچا۔
مگر لیون کو زیادہ سوچنے کا موقعہ نہ ملا۔ وہ بہت جلدی قبریں کھودنے اور کھود کر لاشیں نکالنے، نکال کر انہیں جلانے کے کام میں لگا دیے گئے۔
پہلا دن اس کام میں گزر گیا۔ پھر دوسرا دن بھی گزر گیا۔ پھر اس رات جانے کیا ہُوا کہ نازی سارجنٹ نے لیون کے گروپ کے تمام قیدیوں کو جگا کر زمین بھرنے کے کام پر لگا دیا۔ حالانکہ وہ دن بھر کام کر چکے تھے اور رات کو بھی کام نہ ہوتا تھا۔ مگر نازی سارجنٹ بے حد بوکھلایا ہُوا اور ڈرا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ شاید مورچے پر سے بہت بڑی خبر آئی تھی۔
وہ لوگ رات بھر قبروں پر کام کرتے رہے۔ جو قیدی تھک جاتا تھا۔ اسے نازی سپاہی رائفل کے کندھے سے مار مار کر پھر سے کام کراتے تھے۔ جیسے ان کے سر پر بھوت سوار ہو۔ کام کراتے کراتے نازی سپاہی خوف زدہ نگاہوں سے پیچھے دیکھ لیتے۔ ہولے ہولے سب قبریں سپاٹ ہو گئیں۔ اب صرف چار قبریں باقی رہ گئیں۔ سارجنٹ کائیٹیل فہرست دیکھ کر بولا۔
"ابراہم ایہرین برگ!"

"مُردہ موجود ہے۔" ایک قیدی کھلی قبر کو دیکھ کر بولا۔

"اینتھیل ایہرین برگ!" مردہ موجود ہے۔

"روزا ایہرین برگ!" مردہ موجود ہے۔

"لیون ویانہ؟" سارجنٹ، کائیٹیل نے فہرست کا آخری نام پڑھتے ہوئے پوچھا۔

"قبر خالی ہے؟" لیون نے قبر دیکھ کر جواب دیا۔

"قبر خالی ہے؟ کیسے خالی ہے؟" سارجنٹ کائیٹیل حیرت سے بولا۔

نازی سارجنٹ قبر کے چاروں طرف گھوما۔ پھر بڑی مایوسی سے بولا:

"یہ کیسے ممکن ہے! نازی فہرست میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔ سب کو ہم نے مارا، سب کو ہم نے گاڑا! مردہ یہاں موجود ہونا چاہیئے۔"

"مگر مردہ یہاں موجود نہیں ہے۔" لیون کی آواز میں طنز کی ہلکی سی لہر تھی۔

"تو پھر مردہ کہاں گیا؟" کائیٹیل سوچنے لگا۔ "مُردہ خود چل نہیں سکتا، مُردہ بھاگ نہیں سکتا، پھر مُردہ کہاں گیا۔" بولا! "جلدی بتاؤ، ورنہ تم سب کو گولی مار دونگا سارجنٹ کائیٹیل نے غصے سے رائفل تان لی۔ سارے قیدیوں کے چہرے ڈر سے سوکھ گئے، سوائے لیون کے ....

لیون دھیان سے پورب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں سے روشنی کا لاوا ابل رہا تھا، لیکن، یہ صبح کی روشنی نہ تھی۔ بڑھتی ہوئی روسی فوجوں کا لاوا تھا۔

"جلدی بتاؤ.... اب مجھے بے وقوف مت بناؤ" نازی سارجنٹ بولا۔ اس کی آواز میں خوف کی لرزش تھی۔ "بھلا مردہ خود چل کر کہیں غائب ہو سکتا ہے"
لیون ایک لمحہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ دوسرے لمحے ساری فضا آگ اور بارود کے دھماکے سے گونج اٹھی۔ لوہ وو کے کیمپ کے چاروں طرف دیسی فوجوں کا حملہ ہو گیا۔ نازی سپاہی خوف و ہراس کے مارے ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش کرنے لگے۔ سارجنٹ کائیٹیل بھی ایک طرف کو بھاگنے لگا۔ مگر لیون نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔ اس کی رائفل چھین لی اور اسے زبردستی سے اپنی خالی قبر کے پاس لا کر بولا "سارجنٹ کائیٹیل! نازی کی فہرست میں ایک غلطی باقی رہ گئی۔ وہ انسان کے جذبۂ آزادی کو بھول گئے، وہ یہ بھول گئے کہ مردے بھی چل کر واپس آسکتے ہیں اور ایک دن میں تاریخ بھی بدل سکتی ہے۔ سارجنٹ کائیٹیل! میں جوزف نہیں ہوں، میں لیون ویلز ہوں! غور سے اس خالی قبر کو دیکھو۔ جو میری لاش کے لیے کھودی گئی تھی۔ جانتے ہو سارجنٹ کائیٹیل" یہ قبر خالی کیوں ہے؟"
"نہیں!" سارجنٹ کائیٹیل نے کہا۔
لیون نے سر اونچا کر کے پورب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اب اس خالی قبر میں نازی ازم دفن کیا جائے گا۔"

ٹیکسی ڈرائیور

ٹیکسی ڈرائیور

عدالت کا کمرہ ملزموں، وکیلوں، مدعیوں، گواہوں اور تماشائیوں سے بھر گیا تھا۔ ساڑھے گیارہ بج چکے تھے اور عدالت کی کرسی خالی تھی۔

اس عدالت کے سامنے بکرم ٹیکسی ڈرائیور کی آج بارھویں پیشی تھی۔ پچھلے چار مہینوں میں وہ گیارہ بار اس عدالت کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اور ہر بار پیشی اگلی تاریخ پر ٹل جاتی تھی اور اس کے کیس کی باری نہیں آتی تھی پچھلے چار مہینوں میں وہ گیارہ دن ٹیکسی نہیں چلا سکا تھا اور جب ٹیکسی نہیں چلتی ہے تو گھر کا خرچ نہیں چلتا ہے، صرف بیوی کی زبان چلتی ہے۔

کوئی بڑا مقدمہ نہیں تھا اس کا —— اس نے شہر کے سب سے بڑے آدمی کی کار کو بڑی تیز رفتاری سے جا لیا تھا اور ہزار کوشش کے بعد بھی اس نے بڑے آدمی کی کار کو اپنے سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ حالانکہ بڑے

آدمی کی گاڑی اس کے پیٹ کی طرح بڑی تھی اور اس کی حرص کی طرح لمبی تھی۔ اور اس کا رنگ ایک چھنال عورت کے میک اپ کی طرح بھڑکیلا تھا۔

تو بھی بکرم کی ٹیکسی نے اسے مات دے دی۔

اس میں بکرم کی ٹیکسی سے زیادہ بکرم کی چالاکی کا دخل تھا کیونکہ مشین تو انسان کے ہاتھوں سے چلتی ہے۔

بڑے بڑے آدمی کبھی یہ بھول جاتے ہیں کہ شہر کا سب سے بڑا آدمی بھی ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور کی جرأت پہ بے حد خفا ہو گیا تھا اور اگلے چوک پہ رک کر اس نے ٹریفک انسپکٹر سے اس کم حیثیت ٹیکسی ڈرائیور کی ڈھٹائی کے خلاف شکایت کر دی تھی۔

بکرم کو اس عدالت سے زیادہ سے زیادہ دس روپیہ جرمانہ ہوتا مگر وہ بڑا آدمی معروف آدمی تھا، کسی طرح پیشی پہ حاضر نہ ہوتا تھا اور بکرم کو عدالت میں حاضر ہوتے آج گیارہ دن ہو گئے تھے۔

اس نے گھبرا کر اپنے وکیل سے پوچھا۔ کیا جج صاحب آج نہیں آئیں گے ؟"

"کیا معلوم ؟"

اس کے وکیل نے بڑی بیزاری سے اسے جواب دیا۔ کیونکہ بکرم نے اپنے وکیل کو ہر پیشی پہ تین روپے دینے کا وعدہ کیا تھا اور اپنی سمجھ میں اس

بڑا سستا سودا کیا تھا۔

بکرم کا خیال تھا کہ یہی دو ایک پیشیوں میں فیصلہ ہو جائے گا۔
اسے کیا معلوم تھا کہ معاملہ اس قدر لمبا کھنچے گا۔ کہ اسے تین کی بجائے
تینتیس روپے دینے پڑ جائیں گے اور وکیل اس لیے سختی سے جواب دیے
رہا تھا کہ بھلا آخر تین روپے والے کلیس کو اور کس طرح جواب دیا جا سکتا ہے

اب اگر بیس پچیس کا معاملہ ہوتا تو وکیل بھی مسکراتا۔
ہر وکیل کی مسکراہٹ اس کے تنگ ہونٹوں میں بھنچی رہتی ہے اور اس
مسکراہٹ کو کھول لینے اور باہر لانے کے لیے الگ الگ میٹر ہیں۔
کسی وکیل کی مسکراہٹ پانچ روپے پر کھلتی ہے تو کسی کی پچاس روپے
پر تو کسی کی ہزار روپے پر۔

وکیل کے میٹر اور ٹیکسی کے میٹر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

بکرم نے بڑی بے زاری سے سوچا۔
اب میں اس ظالم کو تینتیس دے چکا ہوں مگر یہ کبھی سیدھے منہ سے
مجھ سے بات نہیں کرتا، کیونکہ میں تین روپے والی آسامی ہوں، اب میں اس
سے کیا کہوں۔

جرمانہ تو مجھے دس روپے سے زیادہ نہ ہوگا لیکن وکیل کو تینتیس روپے
دے چکا ہوں۔

"پیش کار سے معلوم کیجئے کہ عدالت آج آئے گی کہ نہیں آئے گی، میرا ٹیکسی کا نقصان ہوتا ہے۔" بکرم نے بڑے اداس لہجہ میں اپنے وکیل سے کہا۔

وکیل نے گھڑی دیکھ کر کہا: "اوہ پونے بارہ ہو گئے، میرا ایک مقدمہ عدالت ۲ میں ہے۔ میں وہاں جاتا ہوں تم یہیں کورٹ کے اندر بیٹھے رہو، یا کھڑے رہو۔ مگر رہو اسی کورٹ کے اندر۔ اگر تمہارا بلاوا آوے تو مجھے فوراً کورٹ ۲ سے بلا لینا۔

وکیل اپنا پھٹا کالر سہلاتا ہوا اپنی بوریوں کی طرح لٹکی ہوئی پتلون کو جھلاتا ہوا کورٹ ۲ کی طرف چلا گیا۔ عرصہ ہوا اس نے ایک بڑے ایڈووکیٹ کی بدصورت لڑکی سے یہ سوچ کر شادی کی تھی کہ اس کا سسر اپنے داماد کو ایڈووکیٹ بنا دے گا۔ مگر شادی کے چھ مہینے بعد ہی وہ بڑا ایڈووکیٹ چل بسا۔ پھر اگلے دس سالوں میں اس کے سات بچے ہو گئے۔ پھر اس کے کوٹ کا کالر پھٹ گیا۔

تین روپے میں تم کیا کر سکتے ہو۔ اگر زندگی میں تلخی ہی تلخی رہ جائے تو زبان پر مٹھاس کہاں سے آئے۔ وکیل نے کورٹ ۱ کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔

بکرم نے پہلے تو کورٹ ریڈر سے عدالت کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی۔ لیکن جب کورٹ ریڈر نے اسے جھڑک دیا۔ تو وہ سہم کر کھڑے ہو گیا۔ دیر تک اپنی چھدری لیکن خوب صورت اور ملائم داڑھی سہلاتا رہا۔ اس کی داڑھی بڑی خوب صورت اور چھوٹی سی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں

اس کے خاندان کے سبھی مردوں کی آنکھیں خوب صورت تھیں اور چھوٹی چھوٹی خوب صورت سی داڑھیاں تھیں اور وہ سب لوگ اپنے سر پہ بڑی بڑی جٹائیں رکھتے تھے، ریشم کے لچھوں کی طرح ملائم جٹائیں — بالوں کے یہ گھنے گچھے ان کے دھرم اور ان کی تہذیب کے پرانے نشان تھے۔ بکرم کے خاندان میں بڑے بڑے عالم فاضل اور پنڈت ہو گزرے تھے۔ مگر زمانے کی گردش نے بکرم کو ٹیکسی چلانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

بکرم نے چاروں طرف بڑی بے بسی سے دیکھا۔ یکایک اسے کورٹ روم کے بائیں کونے میں آخری سرے پہ ایک دروازے کے قریب جج صاحب کا اردلی نظر آیا۔ یہ اردلی خاص عدالت بہادر کا تھا۔ جب جج صاحب اپنے پرائیویٹ روم سے نکل کر باہر عدالت کے کمرے میں جاتے تھے تو یہ اردلی دو قدم پہلے آگے بڑھ کر پکارتا تھا، گویا ایک طرح سے بھری ہوئی عدالت کو جج صاحب کے آنے کی خبر دیتا تھا۔ پھر جج صاحب کالا چشمہ، کالا گاؤن اور دو پھندنوں والا سفید کالر پہنے ہوئے اندر تشریف لاتے اور ساری عدالت ان کو تعظیم دینے کے لیے کھڑی ہو جاتی اور اس وقت تک کھڑی رہتی۔ جب تک جج صاحب عدالت کی اونچی کرسی پہ نہ بیٹھ جاتے۔ بکرم سب سے نظر بچا کر جج کے پرائیویٹ کمرے کے دروازے پہ کھڑے ہوئے اردلی سے باتیں کرنے لگا۔

"عدالت بہادر کب آئیں گے ؟"

اردلی بولا "وہ ٹھیک گیارہ بجے آتے ہیں جانے کیا بات ہو گئی۔ آج ممکن ہے طبیعت خراب ہو۔"

"طبیعت خراب ہو گی تو عدالت نہیں لگے گی ؟"

"ہاں۔"

"کوئی دوسرا جج نہیں آئے گا ؟"

"کبھی کبھی آتا ہے۔ جب پہلا جج چھٹی لے لیتا ہے۔ لمبی! مگر آج کیا ہو گا، کسے معلوم شاید تھوڑی دیر میں جج صاحب کا ٹیلی فون آئے گا۔"

ابھی اردلی کے منہ سے یہ بات نکلی بھی نہ تھی کہ ٹیلی فون آ گیا اور اردلی ٹیلیفون سننے کے لیے جج صاحب کے پرائیویٹ کمرے میں گھس گیا۔ بکرم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ اردلی ٹیلی فون سننے لگا۔ بکرم کمرے کے اندر کھڑا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ صاف ستھرا کمرہ تھا۔ ایک طرف جج صاحب کے کھانے کی میز تھی۔ ایک طرف آرام کرنے کے لیے کوچ تھا۔ کچھ تپائیاں اور کرسیاں تھیں۔ لوہے کی ایک بڑی الماری تھی، سامنے دیوار پر تین کھونٹیاں تھیں۔ ایک کھونٹی پہ عدالت کا گاؤن ٹنگا تھا، کالا چشمہ اور کالر ایک تپائی پر رکھا تھا ایک طرف جج صاحب کی مدراسی پگڑی تھی جسے پہن کر وہ عدالت کے اندر تشریف لایا کرتے تھے۔

اردلی ٹیلی فون سن کر بکرم کی طرف مڑا اور بولا: "جج صاحب نہیں آئیں گے انہیں زکام ہو گیا ہے۔" پھر فوراً ہی تیور بدل کر بولا۔" مگر تم اندر کیوں چلے آئے تمہیں معلوم نہیں کہ اس کمرے کے اندر کوئی نہیں آسکتا، باہر نکلو۔"

اردلی غصے سے بکرم کی طرف بڑھا۔ بکرم نے فوراً اپنا مضبوط ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

عدالت ۱۲ کا کمرہ تماشائیوں سے اور باہر کے وکیلوں سے بھرتا جا رہا تھا کیوں کہ آج جج کی کرسی پہ ایک نیا جج بیٹھا تھا۔ جسے آج سے پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا اور تماشائیوں سے زیادہ وکیل لوگ یہ دیکھنے کو بے چین تھے کہ نیا جج کس طرح کے فیصلے کرتا ہے اور اس کی قانون کی جانکاری کا کیا حساب کتاب ہے۔

اس وقت مقدمے کا مدعی بالا چندرن تھا۔ بالا چندرن نے اپنے گھر کا ایک کمرہ ایک بڈھی عورت اور اس کے بیٹے کو کرایہ پہ دے رکھا تھا۔ بڈھی اور اس کا بیٹا دس سال سے اس کمرے میں رہتے چلے آئے تھے۔ اور بڑی باقاعدگی سے کرایہ ادا کرتے تھے۔ پھر بڈھی کا جوان بیٹا اپنی مل میں ایک حادثہ کا شکار ہو کر مر گیا تھا اور بڈھی چھ مہینے سے کرایہ نہ دے سکی تھی اور بالا چندرن بڈھی کو کمرے سے نکالنے کے لیے عدالت کا حکم نامہ چاہتا تھا۔

جج نے بالا چندرن سے پوچھا: "تمہارے گھر میں کتنے کمرے ہیں؟"

"دس کمرے ہیں۔" بالا چندرن نے جواب دیا۔

"اور تمہارے خاندان میں کتنے آدمی ہیں؟"

"میں اکیلا ہوں۔"

"اور تمہاری عمر کتنی ہے؟"

"ستر برس کی عمر ہے حضور!"

"تو ستر برس کے بڈھے کو دس کمرے کس لیے چاہئیں؟"

جج نے پوچھا "کیا تم ان دس کمروں میں سے ایک کمرہ اس بڈھی کو نہیں دے سکتے جس کا جوان بیٹا چھ مہینے ہوئے کارخانہ میں مارا گیا۔"

بالا چندرن کا وکیل بولا "حضور سیکشن نمبر فلاں فلاں کی شق فلاں فلاں کی دفعہ فلاں فلاں کی رو سے قانون کہتا ہے . . . ."

"اور انصاف کیا کہتا ہے؟" نیا جج غرا کر بولا۔

اور بالا چندرن کا وکیل وہیں کھڑے کھڑے سہم گیا۔ پھر نئے جج نے مسکرا کر بالا چندرن کی طرف دیکھا۔ جو ستر برس کا دبلا پتلا کمزور آدمی تھا جس کے چہرے پر ستر برس کی کنجوسی سے ہونے والے جذبات کے داغ تھے۔ وہ اپنے ہونٹ سکوڑے ماتھے پر ہزار شکنیں لیے چپ چاپ سب کے سامنے کھڑا تھا۔ نئے جج نے مسکرا کر بالا چندرن کی طرف دیکھا اور کہا "تمہارے گھر میں کتنے نوکر ہیں؟"

"ایک بھی نہیں" بالا چندرن نے جواب دیا۔

"کیا تم اکیلے نہیں محسوس نہیں کرتے ؟"

وکیل کو بڑی حیرت ہوئی، وہ جج سے پوچھنا چاہتا تھا۔ یہ جج کس قسم کے سوال پوچھ رہا ہے، ان سوالوں کا مقدمہ سے کیا تعلق ہے مگر اسے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

"کبھی کبھی اکیلا محسوس کرتا ہوں ۔"

"کیا تم یہ محسوس نہیں کرتے کہ کوئی تمہارا کمرہ جھاڑ دے، تمہارے کپڑے وقت سے نکال دے، تمہارے لیے نہانے کا پانی رکھ دے، تمہارے لیے ناشتہ تیار کر کے لے آئے اور رات کو جب تم سو جاؤ تو کوئی آہستہ سے تمہارے پاؤں دبائے ۔"

"محسوس کرتا ہوں حضور۔"

"اور اگر کوئی ان تمام خدمتوں کے بدلے تم سے تمہارے دس کمروں کے بڑے مکان میں صرف ایک کمرہ اپنے رہنے کے لیے چاہے اور کوئی تم سے ایک پیسہ نہ مانگے صرف ایک کمرہ اور دو وقت کھانا ۔۔۔ تو کیا تم انکار کر دو گے ؟"

بالا چندرن نے ناامید ہو کر کہا : "مگر حضور ایسا آدمی اس دنیا میں آجکل کہاں ملے گا ؟ اسی لیے تو میں نوکر نہیں رکھتا ۔"

بڈھی عورت کا چہرہ کھل اٹھا۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر جج کو دعائیں دینے لگی۔ پھر اس نے بالا چندرن سے ڈانٹ کر کہا۔ "اب گھر چل تیرے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

بڈھی عورت نے بڈھے کو ہاتھ سے پکڑ لیا اور ساری عدالت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بالا چندرن کے وکیل نے بہت سمجھایا۔ "بالا چندرن تم گھبراؤ نہیں میں اس فیصلہ کے خلاف اپیل دائر کر دوں گا۔"

بالا چندرن نے کہا "تم ایسا کچھ نہیں کرو گے مجھے یہ منظور ہے۔" پھر وہ بڈھی کی طرف دیکھ کر مسکرایا، جیسے سوکھی دھرتی کے سینے میں نرمل جل کی دھارا پھوٹ پڑی ہو۔

(۲)

عدالت کے کٹہرے میں ایک خوب صورت اینگلو انڈین لڑکی کھڑی تھی وہ اس طرح کھڑی تھی جیسے عدالت کے کٹہرے میں کسی نے ایک خوبصورت پھولوں سے بھرا گلدان رکھ دیا ہو۔ اس کے پیلے فراک پر اودے اودے پھول وکیلوں کی نظروں میں مسکرانے لگے۔ جج نے پوچھا: "تو تم اپنے شوہر سے طلاق چاہتی ہو؟"

"جی ہاں۔"

"کیا تمہارا شوہر بے کار ہے؟"

"جی نہیں، وہ تو ریلوے میں ڈرائیور ہے۔"

اینگلو انڈین ڈرائیور بھی قریب ہی کھڑا تھا اور بار بار رومال سے اپنا گورا چہرہ پونچھتا جاتا تھا۔ آج اس کی بھرپور بے عزتی کا دن تھا۔ آج اگر یہ عدالت کا کمرہ کسی ریل گاڑی کا ڈبہ ہوتا تو وہ پوری ریل گاڑی کو کسی کھڈ میں پھینک دیتا۔

"تو تم اس سے طلاق کیوں چاہتی ہو؟"

"میرے شوہر کے منہ سے بو آتی ہے۔"

"کیوں آتی ہے؟"

"اسے ہر روز رات کے کھانے کے ساتھ بھنی ہوئی لہسن کھانے کا بہت شوق ہے۔"

"تو تم اسے رات کو ٹوتھ برش استعمال کرنے پر مجبور کیوں نہیں کرتیں؟"

"میں تو کہتی ہوں اسے، پر یہ مانتا نہیں۔"

"اگر تم سونے سے پہلے ایک ٹوتھ برش پر ٹوتھ پیسٹ لگا کر اس کے منہ میں دے دیا کرو تو کیا یہ دانت صاف کرنے پر مجبور نہیں ہو جائیگا؟"

لڑکی چپ ہو گئی، پھر بولی۔ "اور حضور یہ آدمی روز رات کو جوتوں سمیت میرے بستر میں گھس آتا ہے۔"

"تو پھر تم بھی جوتوں سمیت سو جایا کرو۔" جج نے کہا۔
"بڑی آسان ترکیب ہے، دو دن میں اس کی عادت ٹھیک ہو جائے گی۔
"مگر"۔ اینگلو انڈین لڑکی کا وکیل بولا۔ "تعزیراتِ ہند کی سیکشن فلاں فلاں کی دفعہ فلاں فلاں کے مطابق اگر شوہر بیوی ....."
"تم چپ رہو" جج نے وکیل کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "شوہر بیوی کے معاملے میں تم بولنے والے کون ہوتے ہو۔"
پھر جج نے ٹائپسٹ کو اپنا فیصلہ لکھواتے ہوئے کہا۔ "لکھو! اگر شوہر جوتے پہن کر بستر میں گھسنے کی کوشش کرے تو بیوی کو بھی چپل پہن کر سونے کا پورا پورا حق ہے۔ کیس ڈسمس!"

(۳)

اب کٹہرے میں چار لی ٹیکسٹائل مل کا مالک کرشنما چاری کھڑا تھا۔ وہ بے حد لمبا اور دبلا تھا۔ اس کے کانوں میں سفید ہیرے جگمگا رہے تھے اور وہ اپنی سفید ریشم کی قمیص اور دھوتی میں بالکل دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک ایسا دیوتا جو ابھی مندر سے اٹھ کر عدالت میں چلا آیا ہو۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں جو اس نے کٹہرے پر رکھی ہوئی تھیں۔ بڑی لمبی نازک نرم اور گداز دکھائی دیتی تھیں۔ وہ ایسے آدمی کی انگلیاں دکھائی دیتی تھیں جس نے

زندگی بھر نوٹ گننے کے سوائے اور کوئی کام نہ کیا ہو۔ وہ عدالت کے کٹہرے میں بالکل آرام اور سکون سے کھڑا تھا۔

جج نے کہا: "تو تم اقبال کرتے ہو کہ تمہاری مل میں کام کرنے والے مزدور ریڈی کا ہاتھ مل کی ایک مشین سے کٹ گیا؟"

"جی ہاں۔"

"اور اس اقبال کے بعد بھی تم ریڈی کو جرمانہ دینے سے انکار کرتے ہو۔"

"جی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ ریڈی کا ہاتھ اس کی غفلت سے کٹا ہے۔ اس کی اپنی غفلت سے۔ میری مل کی مشین خراب نہیں ہے۔"

"میری مل؟ . . . . وہ تمہاری مل کیسے ہوئی؟"

"حضور میں اس کا مالک ہوں۔"

"تم اس مل کے مالک کیسے ہوئے؟"

"حضور میں نے اس پر روپیہ لگایا ہے۔ سنہ لاکھ روپیہ اب تک لگا چکا ہوں۔"

"اور کتنا کما چکے ہو؟"

"تین کروڑ چوالیس لاکھ۔"

"اگر اس مل میں ایک مزدور بھی کام نہ کرتا تو تمہارا منافع کتنا ہوتا؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے حضور! اگر مل میں مزدور کام نہ کریں تو منافع کہاں سے آئیگا۔"

"تم اقبال کرتے ہو کہ تمہارا ستر لاکھ روپیہ بجائے خود کوئی چیز نہیں ہے، جب تک انسان کے ہاتھ اس کو نہ چلائیں۔"

کرشناچاری نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"یہ تو درست ہے حضور۔"

"تو جو ہاتھ منافع دیتے ہیں انہیں منافع کا حق دار کیوں نہ سمجھا جائے۔ اس کے ہاتھ اگر کسی بھی غفلت سے، تمہاری یا ان کی غفلت سے کٹ جائیں تو ان ہاتھوں کے مالکوں کو زندگی بھر کیلئے پنشن کیوں نہ دی جائے؟"

"اگر یہ تو مل مالک کے حقوق پر دست اندازی ہو گی۔" کرشناچاری کا وکیل چلّایا۔

"مگر سیکشن فلاں فلاں کی شق فلاں فلاں کی دفعہ فلاں فلاں کے مطابق مل مالک کی یہ صحیح تعریف۔۔۔۔"

"کسی شریف آدمی کی تعریف کرو وکیل صاحب۔" جج نے غرّا کر کرشناچاری کے وکیل سے کہا۔ پھر مڑ کر ٹائپسٹ سے بولا "لکھو فیصلہ"

کرشناچاری نے مل میں ستر لاکھ روپیہ لگایا اور تین کروڑ چالیس لاکھ وصول کیا۔ لہٰذا وہ اپنا روپیہ مع سود کے واپس لے چکا ہے۔ لہٰذا آج سے یہ مل اس کی نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کی ہے جنہوں نے آج تک اپنے ہاتھوں کی محنت کی پونجی اس میں لگائی ہے اور آج تک لگاتے آرہے ہیں۔

اس کے علاوہ کرشنما چاری چونکہ خود اپنے ہاتھوں کی محنت اس ہل میں نہیں لگاتا ہے اور اس پر ہل کے منافع کا مکمل دعوے دار بنتا ہے۔ لہٰذا یہ عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ ہل کے منافع میں سے ریڈھی کے لیے عمر بھر کی پنشن جاری کی جائے اور کرشنما چاری کے دونوں ہاتھ کاٹ لیے جائیں۔ کیونکہ وہ ہاتھ کوئی کام نہیں کرتے اور ہمارے ملک میں صرف کام کرنے والوں کے ہاتھوں کی ضرورت ہے۔"

"کیا بکواس ہے۔"

کرشنما چاری زور سے چلایا۔

"یہ جج ہے یا کوئی پاگل آدمی ہے۔" بہت سے وکیل غصہ سے بول پڑے۔

نیا جج کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک پھٹیچر وکیل اپنے پھٹے کالر کو سہلاتا ہوا بھاگتا کورٹ روم میں داخل ہوا اور کہنے لگا "اسے پکڑ لو، اسے پکڑ لو، یہ جج نہیں ہے یہ تو میرا مؤکل ہے۔ بکرم ٹیکسی والا۔ . . یہ جج کی کرسی پر کیوں اور کس طرح بیٹھا ہے"۔

کورٹ نمبر ۲ میں جب بکرم ٹیکسی والے کو پیش کیا گیا تو عدالت نے اسے پوچھا۔

"تمہارا نام ؟"

"وکرما دیتہ۔"

"عمر" ؟

"دو ہزار برس۔"

"کیا کام کرتے ہو ؟"

"ٹیکسی چلاتا ہوں۔"

"تم نے آنریبل عدالت کی غیر حاضری میں عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر عدالت کی ہتک کیوں کی ؟"

عدالت ۲۱ نے پوچھا۔

سب لوگ حیرت سے بکرم ٹیکسی والے کی طرف دیکھنے لگے۔

دیر تک بکرم ٹیکسی والے کا سر جھکا رہا، پھر اس نے آہستہ سے سر اُٹھایا اور بولا:

"حضور! زندگی ٹیکسی کی رفتار سے بھاگتی ہے، لیکن قانون ابھی تک چھکڑے کی رفتار سے چلتا ہے۔

میں بے قصور ہوں حضور!

میں عدالت کی کرسی پر نہیں بیٹھا تھا۔

میں نے صرف اس کے ایکسی لیٹر پہ پاؤں رکھا تھا۔"

"چھ مہینے کی قید با مشقت۔"

عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا اور پولیس کے دو سپاہی وکرمادیتہ کو پکڑ کر عدالت سے باہر لے گئے۔

——— ۰ ———